

# آتشِ جنار

جی ایسم لون



## عرضِ ناشر

نامور کشمیری حریت پسند راہنما جناب جی ایم لون کا عدالتی بیان ”آتش چنار“ ایک بار پھر کشمیر کی نئی نسل کے مطالعے اور استفادہ کے لئے شائع کیا جا رہا ہے۔ میرا جی تو یہ چاہتا ہے کہ اس تاریخی دستاویز کو میں چاندی کے اوراق پر آپ زر سے لکھ کر شائع کرواؤں لیکن وسائل کی کمی اور تہی دامنہ کے سبب یہ ممکن نہیں ہے۔ بہر حال قارئین کرام میں سے اگر کوئی اس ضمن میں دستِ تعاون آگے بڑھائے تو اس کتابچے کی وسیع پیمانے پر تشہیر کی جاسکتی ہے۔

یہ مختصر سی کتاب جناب جی ایم لون کا وہ عدالتی بیان ہے جو انہوں نے دو کشمیری حریت پسندوں اشرف قریشی اور ہاشم قریشی کے ہاتھوں 30 جنوری 1971ء کو بھارتی طیارہ گنگا انواہ کیے جانے کے نتیجے میں پاکستان کے عدالتی کنہرے میں کھڑے ہو کر دیا تھا۔ گنگا طیارے کے انواء نے حکومت پاکستان کی منافقانہ، دوغلی اور بدعتی پر مبنی کشمیر پالیسی کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا اور جی ایم لون کی اس آپ بیتی نے ہم کشمیریوں کی آنکھیں کھول کر رکھ دی تھیں۔ ہماری آنکھوں سے خوش فہمیوں کے پردے ہٹا کر ہمیں دکھادیا تھا کہ ہمارے حق خود ارادیت کا بدترین دشمن پاکستان کا حکمران نولہ کس گھٹاؤ نے کردار کا مالک ہے۔ جی ایم لون کے اس ایمان افروز اور تاریخی بیان کا کچھ حصہ اگرچہ راقم قبل ازیں اپنی تالیف ”دیوانوں پہ کیا گزری“ میں شائع کر چکا ہے۔ اب یہ بیان ہو بہو الگ کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ کشمیر کی نئی نسل اس مختصر سے کتابچے کو حرف بہ حرف پڑھے، سمجھے گی اور اپنے اسلاف کی قربانیوں سے آگاہی کے ساتھ ساتھ آزادی وطن کے دشمنوں کو بھی اچھی طرح پہچان لے گی۔ غلام قومیوں اگر دوستوں اور دشمنوں کو نہ پہچان سکیں تو وہ آزادی کی نعمت سے محروم رہتی ہیں۔

محمد سعید اسعد

ڈائریکٹر ادارہ نیکس میرپور



## پیش لفظ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز  
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

قادرِ مطلق کی دین، انسان کی سرشت میں امنگوں اور صلاحیتوں کا ایک بیش بہا خزانہ موجود ہے۔ جس کا بطریق احسن استفادہ کرنے کی بدولت وہ علم و ہنر کے اوج کمال پر پہنچ سکتا ہے۔ کائنات کی ہر شے پر برتری حاصل کر سکتا ہے اور تمام مخلوقات میں وہ عظیم مرتبہ اور اعلیٰ مقام حاصل کر سکتا ہے جو اُس کے لئے مقدر کیا جا چکا ہے۔ وہ پرندوں سے بھی اونچا اڑ سکتا ہے۔ چاند اور ستاروں پر کمندیں بھی ڈال سکتا ہے، عمیق سمندروں کی تہ، زمین کے سات طباق اور اجرام فلکی کی خبریں لاسکتا ہے۔ ان کے رازوں سے واقف اور ان کی دولت سے مستفید ہو سکتا ہے۔ وہ حسن سلوک اور پیار سے انسانوں کو تو کیا وحشی حیوانوں کو بھی اپنا گرویدہ بنا سکتا ہے۔ اپنے بلند اخلاق و کردار کی بدولت گمراہ انسانیت کو راہِ راست پر لاسکتا ہے اور ایمان و یقین، صبر و ثبات قدمی کی بدولت آتشِ نمرود اور طوفانِ نوع سے بھی سلامت گزر سکتا ہے۔ سنگلاخ کو ہستان کو کھود کر جوئے شیر بھی لاسکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ایسا کرنے کی اُمنگ، لگن اور ارادہ رکھتے ہوئے اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو بروئے کار لانے کے مواقع سے پوری طرح بہرہ یاب ہو اور اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کی اُسے آزادی حاصل ہو۔ آزادی و خود اختیاری کی بدولت افراد کے جو ہر گھلتے ہیں اور وہ انسانیت کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ لیکن جب اُس کی آزادی چھن جاتی ہے، اُس کی صلاحیتیں بیکار

اور اس کی زندگی بے مقصد بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ غلام بن کر ایک چوپائے کی طرح محض اپنی جسمانی ضروریات کو پورا کرنے کے عوض اوروں کے ہاتھوں ہانکے جانے کی ذلت برداشت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً اُس کا وجود نہ صرف اُس کے اپنے لئے وبال جان بن جاتا ہے بلکہ وہ اس قوم و ملت اور معاشرے کے لئے جس کا وہ فرد ہو، بارگراں اور باعثِ عار ہوتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ آزادی کا ایک لمحہ بھی غلامی کی صد سالہ زندگی سے بہتر و افضل ہے۔ قوم اور اس کے افراد کی آزادی یقیناً لازم و ملزوم ہے کیونکہ ایک آزاد و خود مختار قوم ہی اپنے افراد کو وہ صلاحیتیں اور قوتیں بروئے کار لانے اور پروان چڑھانے کے مواقع اور آزادی بہم پہنچا سکتی ہے۔ یہی افراد مل کر اپنی قومی و ملی تمناؤں اور امنگوں کو پورا کرنے اور ہر میدانِ ترقی میں آگے بڑھنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور ایسے ہی افراد پر مشتمل قوم و ملت دنیا میں عزت کا مقام حاصل کر سکتی ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ کشمیر ہزاروں سال آزادی و خود مختاری سے بہرہ ور رہا ہے اور اس سُنہری دور میں اس کی زرخیز مٹی نے بڑے بڑے طاقتور و ترقی پرور حکمران، نامور فاتح، جرنیل، یکتائے روزگار علماء و شعراء، مصنفین و مؤرخین اور باکمال صالحین و مصلحین پیدا کئے تھے کہ اس کا مقابلہ اس زمانے کے خوشحال و طاقتور ایران کے ساتھ کیا جانے لگا اور اہل کشمیر کی ذہانت و ہنرمندی اور بہادری کے چرچے ہونے لگے۔ لیکن جب یہ قوم آزادی سے محروم ہو گئی تو اس کی عزت و شہرت خاک میں مل گئی۔ مغل حاکمیت، افغان تسلط، سکھ شاہی اور ڈوگرہ راج کے اذیت ناک روح فرسا د جان لیو اور بنامی نے اس قوم کا یہ حال بنا دیا کہ مقلہ مشرقِ علامہ اقبالؒ جو اپنے کشمیری نژاد ہونے اور اپنے اسلاف کی عظمت و شہرت پر فخر کرتے تھے، یوں نوحہ خواں ہوئے۔

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر

کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

سینہء افلاک سے اُٹھتی ہے آہ سوز ناک



مردِ مَر ہوتا ہے جب مرعوب سلطان و امیر  
 کہہ رہا ہے داستان بے دردیء ایام کی  
 کوہ کے دامن میں وہ غم خانہء دہقان پیر  
 آہ وہ قوم نجیب و چرب دست و تر دماغ  
 ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر  
 اسی مردِ درویش نے بارگاہِ الٰہی میں التجا کی:-

توڑ اُس دستِ جفا کیش کو یارب جس نے  
 روحِ آزادیء کشمیر کو پامال کیا

اسے بنی نوعِ انسان کی بد قسمتی کیئے کہ انسان کے ازلی دشمن شیطان کی اولاد، انسانوں  
 ہی کا روپ دھار کر ہمیشہ سے آزادی کے علمبرداروں کو طرح طرح کے جبر و استبداد کے ذریعے  
 مجبور و مفلوج کر کے ذلیل و رسوا کرنے کے درپے رہی ہے۔ خلیجی کہ بیسویں صدی کے اس مہذب و  
 ترقی یافتہ دور میں بھی انسانیت کشی کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ فلسطین و ویت نام میں انسانوں کا قتل عام  
 کیا جا رہا ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں مہاجن وطن اور حریت پسند کشمیریوں پر مظالم توڑے جا رہے ہیں۔

من از بیگانگان ہر گز نہ ظالم

کہ بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد

غضب تو یہ ہے کہ پاکستان اور آزاد کشمیر جیسے نظریاتی ممالک میں بھی تحفظ امن و قانون  
 کے نام پر انسانوں کے ساتھ انسانیت سے دور سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔ جس کے شکار علامہ مشرقی  
 جیسی بلند پایہ اور اولوالعزم شخصیت اور محسنِ ناصری جیسے محبِ وطن ہو چکے ہیں اور جس کی تازہ مثال  
 لاہور کے شاہی قلعہ اور چونا منڈی، آزاد کشمیر کے دلائی کیمپ اور بلیک فورٹ اور دیگر متعدد بوچڑ  
 خانوں میں کشمیری حریت پسندوں پر وہ انتہائی وحشیانہ تشدد، شرافت و شائستگی سے گرا ہوا سلوک

اور خدا اور رسول ﷺ کا نام لینے پر ان کی وہ توہین ہے، جس کی داستان سن کر ہر مہذب انسان کا دل مجروح ہوتا ہے۔ ہر محب وطن کا خون کھول اٹھتا ہے اور ہر شریف و شائستہ پاکستانی کی گردن شرم سے جھک جاتی ہے۔ اس المناک داستان کی تفصیلات پاکستان کے دو فاضل ججوں پر مشتمل سپیشل کورٹ میں پیش ہر کر منصف شہود پر آچکی ہیں اور تاریخ کا حصہ بن گئی ہیں۔

شائستہ اور مہذب انسانوں کی نظروں میں اس سے بدتر قابل نفرت و قابل مذمت کون سا فعل ہو سکتا ہے جب اس شرمناک اور سفاکانہ سلوک کا نشانہ ان شخصیتوں کو بنایا گیا ہو جن کے بزرگوں نے مطلق العنان ڈوگرہ حکومت کے خلاف تحریک میں شریک ہو کر برسوں قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں بلکہ جن کے لواحقین اب بھی بھارتی جارحیت سے برسرِ پیکار رہنے کی پاداش میں سزائیں بھگت رہے ہیں اور جن کی عسکری تنظیم نے حقیر سامان کے ساتھ بھارتی قابض افواج کے خلاف عوامی مسلح جدوجہد کی ابتداء کر کے اور بھارتی طیارہ لنگا کو اغوا کر کے غاصب بھارتی سامراج کو دنیا میں ننگا کر دیا تھا اور اُس کا غرور توڑ کر آزادی کشمیر کے حامیوں سے خراج تحسین حاصل کیا تھا۔

جموں کشمیر محاذ رائے شماری کے انہی محبان وطن راہنماؤں میں جناب غلام محمد لون بھی شامل ہیں جو اپنی خداداد قابلیت، ہنرمندی اور محنت کی بدولت ایک نمایاں مقام حاصل کر چکے ہیں۔ لون صاحب اور اُن کے بزرگ تحریک حریت کشمیر کے لئے قابلِ قدر خدمات انجام دینے کے لئے مقبوضہ کشمیر میں مشہور ہیں اور شیر کشمیر کے مقربین میں شامل ہیں۔ لون صاحب تحریک آزادی کشمیر کے ساتھ تقریباً بیس سال سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے پاکستان میں مقیم کشمیری مہاجرین کے منتخب نمائندہ کی حیثیت سے آزاد کشمیر کی سٹیٹ کونسل 1962-64 کے دوران اپنی سیاسی بصیرت، حقیقت پسندی، جذبہ حریت اور عوام دوستی کا ثبوت دے کر عوام کو اپنا گرویدہ بنایا تھا۔ انہوں نے پاکستان کو سیٹو سینو اور دیگر فوجی معاہدات سے علیحدہ ہو جانے اور عوامی جمہوریہ



چین سے گہرا رابطہ کرنے کا مشورہ دیا تھا اور آزاد کشمیر کو ایک آزاد خود مختار ریاست تسلیم کر کے اسے چین سمیت دیگر دوست ممالک سے تسلیم کرانے اور اس طرح حکومت آزاد کشمیر کو حریت پسند افریقی و ایشیائی ممالک کی اعانت و امداد سے آزادیء کشمیر کی جنگ کرنے کے قابل بنانے کی تجویزیں پُر زور دلائل کے ساتھ پیش کی تھیں۔

لون صاحب کا شمار جموں کشمیر محاذ رائے شماری (برائے آزاد کشمیر پاکستان) کے بانی اراکین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی کاروباری مصروفیات کے باوجود اس تنظیم کی کوششوں میں ہمیشہ بھرپور حصہ لیا ہے۔ ریاست جموں کشمیر کی وحدت و سالمیت اس کی آزادی اور اس کے عوم کی خوشحالی کے لئے جدوجہد کرنا ان کا جزو ایمان رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے شاہی قلعہ لاہور میں شدید اذیتیں جھیلنے کے بعد بھی عدالت عالیہ کو جو تحریری بیان پیش کیا ہے۔ اُس کے آخری الفاظ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ ”اگر ریاست کی وحدت و سالمیت کو بحال کرنے اور اُس کو آزاد کرانے کی جدوجہد ایک سنگین جُرم ہے تو میں قرار واقعی مجرم ہوں اور اگر اس جرم کی سزا تختہ دار ہے تو میں خوشی سے دار پر چڑھنے کے لئے تیار ہوں۔“

بکھنے کی دل کی آگ نہیں زیرِ خاک بھی

ہوگا درخت گور پہ میری چنار کا

لون صاحب کی یہ ثابت قدی حریت پسند کشمیریوں کے لئے گھناؤپ اندھیروں میں روشن مشعل کا کام دے سکتی ہے اور کڑی سے کڑی آزمائشوں کے طوفانوں میں بھی ان کے صبر و استقلال کی مثال انہیں سہارا دے سکتی ہے۔

آئندہ صفحات میں ہم جناب جی۔ ایم لون کا وہ عدالتی بیان پیش کر رہے ہیں جس میں انہوں نے کشمیریوں کی قومی جدوجہد آزادی کے مختلف خط و خال نمایاں کئے ہیں اور قومی محاذ آزادی سے وابستگی کی بناء پر انہیں جن رُوح فرسا مظالم کا پاکستان میں نشانہ بنایا گیا وہ داستان

اسیری انہوں نے شرح و بسط کے ساتھ بیان کی ہے۔ اس کتابچہ کا حصہ اوّل لون صاحب کے انگریزی بیان کے کچھ حصوں کے ترجمے پر مشتمل ہے اور حصہ دوم میں عدالت میں اُن کے دائر کردہ اُردو بیان کا مکمل متن شائع کیا جا رہا ہے۔

میر ہدایت اللہ

قائم مقام صدر

جموں کشمیر محاذ رائے شماری

برائے آزاد کشمیر و پاکستان

1972ء



## حصہ اول

## ابتدائیہ

جناب والا!

میرا عدالت کے کٹہرے میں آج کھڑا ہونا بے سبب نہیں ہے۔ میرا اصل مجرم یہ ہے کہ میں اپنے وطن کشمیر سے محبت کرتا ہوں۔ اس ملک میں کچھ مفاد پرست عناصر ایسے بھی ہیں جو آزادی کشمیر کے سخت مخالف ہیں۔ یہ بات ان عناصر کے مفاد میں ہے کہ کشمیر ہمیشہ کے لئے بھارتی تسلط میں رہے۔ حد متار کہ جنگ کے اس طرف اسلام آباد کی وزارت امور کشمیر کو (جو کہ پاکستان کی بیورو کریسی کی نمائندہ مظہر ہے) میں کشمیریوں کی آزادی کی دشمن نمبر ایک سمجھتا ہوں۔ اس وزارت نے ماضی میں اب تک جو کردار ادا کیا ہے، وہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اس نے قدم قدم پر تحریک آزادی کشمیر کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کیں اور اس تحریک کو ختم کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ اپنی سیاسی زندگی کے دوران بالعموم اور آزاد کشمیر کی سٹیٹ کونسل کے رکن کی حیثیت سے بالخصوص میں نے افر شاہی کے اس ادارے کے منفی کردار کو طشت از بام کرنے اور تحریک حریت کو مزید کوئی زک پہنچانے سے باز رکھنے کے لئے حتی المقدور کوشش کی ہے۔ یہ انہی کوششوں کا ثمر ہے کہ آج میں انتہائی گھناؤنے الزامات میں اس عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہوں۔ میں اس معزز عدالت کے سامنے واضح کاف الفاظ میں یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ میں پاکستان کا دشمن نہیں۔ جیسا کہ استغاثہ نے الزام لگایا ہے۔ پاکستان کے عوام کے لئے میرے دل میں محبت اور احترام کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ بہر حال بیورو کریسی اور ان مفاد پرست عناصر کو جنہوں نے اس ملک کے عوام کا خون پوسا ہے، پاکستان کا نام نہیں دے سکتا۔ میرے لئے پاکستان کا تصور بہت مقدس ہے اور ان عناصر کو پاکستان کا نام دے کر میں اس تصور کو آلودہ نہیں کرنا چاہتا۔

میں بچی خانی ٹولے کے دورِ آمریت کی کوتاہ نگاہی کا شکار ہوا ہوں۔ بچی خاں نے  
 جموں کشمیر کی آزادی کی مسلح جدوجہد کی تحریک کو اس لئے کچل دینا چاہا کہ اُسے اس تحریک میں اپنی  
 آمریت کی تباہی کا عنوان نظر آیا۔ محض یہی وجہ تھی کہ اس نے کشمیریوں کی مسلح جنگِ آزادی کو ختم  
 کرنے کی ناپاک کوشش کی۔ صرف تاریخ ہی بتا سکے گی کہ بچی خاں اپنی اس کوشش میں کہاں تک  
 کامیاب ہوا۔

### ابتدائی حالاتِ زندگی

میں سرینگر کے ایک تاجر گھرانے میں 1926ء میں پیدا ہوا۔ میٹرک تک تعلیم میں نے  
 سرینگر میں ہی حاصل کی۔ میں پہلی بار 1942ء میں کراچی آیا۔ تب سے میں یہیں پر رہائش پذیر  
 ہوں اور کاروبار کر رہا ہوں۔ سوائے ان چند مختصر وقفوں کے جو میں اپنے والدین اور رشتہ داروں  
 سے ملنے کی خاطر سرینگر آتا جاتا رہا۔ تقسیمِ ہند کے وقت میں سرینگر میں موجود تھا اور چونکہ حالات نا  
 سازگار تھے اس لئے مجھے وہ پورا موسم سرما سرینگر میں ہی گزارنا پڑا۔ میں اپریل یا مئی 1948ء  
 میں ایک مہاجر قافلہ کے ساتھ جو سوچیت گڑھ کے راستے پاکستان میں داخل ہوا تھا۔ واپس کراچی  
 آ گیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک میں صرف دو مرتبہ کشمیر گیا ہوں۔ پہلی بار 1950ء میں اور  
 دوسری بار 1956ء میں۔ دونوں مرتبہ میں نے یہ سفر باقاعدہ پاسپورٹ پر کئے اور میرا قیام سرینگر  
 میں چند ماہ سے زیادہ نہیں رہا۔ دونوں مرتبہ میرے کشمیر جانے کا مقصد اپنے والدین اور دیگر اعزاء و  
 اقارب کی ملاقات تھا۔ کراچی میں تجارت کے ساتھ ساتھ میں نے اردو کالج میں داخلہ لیا اور تعلیم  
 حاصل کرتا رہا۔ میں نے بی۔ اے تک کی تعلیم اسی کالج میں مکمل کی۔ ڈی۔ آئی۔ جی اطہر کی رپورٹ  
 پڑھ کر میں اس شخص کی لاعلمی اور عدم واقفیت پر ترس کھائے بغیر نہ رہ سکا۔ 1974ء سے پہلے شیخ محمد  
 عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کی رکنیت اور اُس کے بعد بھارتی مقبوضہ کشمیر کی نیشنل ملیشیا میں میری شمولیت  
 کا اس لئے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس تمام عرصہ کے دوران میں کشمیر میں موجود ہی نہیں تھا۔



## سیاسی کردار

بھارتی مقبوضہ کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ کی وزارتِ عظمیٰ سے برطرفی اور گرفتاری کے واقعہ نے مجھے عملی سیاسیات کے میدان میں قدم رکھنے پر مجبور کیا۔ اس موقع پر میں نے مسٹر کے۔ ایچ خورشید کے ساتھ مل کر احتجاجی جلسوں و جلوسوں اور ہڑتال وغیرہ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ہم نے ایک ایڈ ہاک کمیٹی بنائی جس کے صدر کے۔ ایچ خورشید تھے اور جس کے ممبران میں علاوہ اور لوگوں کے میر عبدالقیوم اور میں شامل تھا اور جس کے ذمہ یہ کام سونپا گیا کہ وہ آزاد کشمیر اور پاکستان میں تحریک آزادی کشمیر کے لئے ایک منصوبہ تیار کرے۔ اسی دوران چوہدری غلام عباس نے بھی ”کشمیر لبریشن موومنٹ“ کے نام سے ایک تحریک چلانے کا اعلان کیا۔ ہم سب نے اس تحریک کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا اور اس طرح سے ایک الگ تحریک چلانے کا خیال ترک کر دیا گیا۔ پاکستان میں مارشل لاء لگ جانے پر کے ایل ایم ختم ہو گئی۔ اس کے بعد اگرچہ کشمیر کی سیاسیات میں میری دلچسپی برقرار رہی۔ لیکن عملاً میں کسی سیاسی جماعت کا کارکن نہیں رہا۔ کیونکہ پاکستان میں مارشل لاء کے تحت سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔

1961ء میں آزاد کشمیر سٹیٹ کونسل کے انتخابات بنیادی جمہوریت کے نظام کے تحت منعقد ہوئے۔ میں نے ان انتخابات میں حصہ لیا اور کشمیری مہاجرین کے تین نشستوں کے لئے الیکشن لڑنے والے بارہ امیدواروں میں سے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کر کے کامیاب ہو گیا۔ اس انتخاب میں میں نے علی الاعلان شیخ محمد عبداللہ کے سیاسی مسلک کے حامی کی حیثیت سے حصہ لیا۔ میں نے اپنے انتخابی منشور میں اس امر کو واضح کر دیا کہ میں کشمیریوں کے مکمل حق خود اختیاری کا حامی ہوں اور میں مسئلہ کشمیر کو بھارت اور پاکستان کے درمیان سرحدی تنازعہ نہیں سمجھتا۔ میں نے اپنے انتخابی منشور میں یہ عہد بھی کیا تھا کہ سٹیٹ کونسل کی حیثیت سے وصول ہونے والی مشاہرہ (آنریریم) کی ساری رقم تحریک آزادی کشمیر کے لئے وقف کر دوں گا۔

## سٹیٹ کونسلر کی حیثیت سے

سٹیٹ کونسلر کی حیثیت سے سیاسیات کشمیر میں میرا کردار مسلمہ اور قابل ذکر حیثیت رکھتا ہے۔ کونسل میں میری تقاریر اس بات کی گواہ ہیں کہ وزارت امور کشمیر کی نااہلیت اور بدعنوانیوں کو جس انداز سے میں نے براہ راست ہدف تنقید بنایا کسی اور نے اس کی جرات نہ کی۔ میں بار بار اس بات پر زور دیتا رہا ہوں کہ آزاد کشمیر کو ایک مثالی ریاست بنایا جائے تاکہ بھارت کے اس پروپیگنڈے کا توڑ ہو سکے کہ ”آزاد علاقوں میں غربت اور افلاس کا دور دورہ ہے“۔ اور یہ ریاست بھارتی مقبوضہ کشمیر کے لئے باعث کشش بن جائے۔ میں گلگت بلتستان سے ایف سی آر کے خاتمہ اور ان علاقوں کو مناسب نمائندگی دے کر حکومت آزاد کشمیر کے دائرہ کار کو ان علاقوں تک بڑھانے کے لئے مسلسل آواز اٹھاتا رہا ہوں۔ مجھے یہ فخر بھی حاصل ہے کہ میں نے آزاد کشمیر کی سٹیٹ کونسل میں حکومت آزاد کشمیر کو تسلیم کرنے کی تاریخی قرارداد پیش کی تھی۔

مجھے سٹیٹ کونسلر کی حیثیت سے اس وقت کے پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل ایوب خاں سے ملنے کا موقع ملا۔ یہ ملاقات جس میں صدر آزاد کشمیر کے ایچ خورشید بھی شامل تھے۔ اس وقت ہوئی جب کہ 1962ء کی چین بھارت جنگ ابھی جاری تھی۔ میں نے فیلڈ مارشل ایوب خاں سے اس بات پر زور دیا کہ کشمیر میں بھارتی تسلط کے خلاف فوجی اقدام کیا جانا چاہیے۔ ورنہ شاید یہ موقع دوبارہ کبھی نہ آ سکے گا۔ چوہدری غلام عباس نے بھی اسی قسم کا موہقف اختیار کیا ہوا تھا اور انہوں نے مطالبہ کیا تھا کہ ”گاڑی کو کسی قیمت پر چھوٹے نہیں دینا چاہیے“ ایوب خاں اس کے جواب میں بڑے برا فروخت ہو گئے۔ انہوں نے چوہدری غلام عباس کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کئے۔ ایوب خاں نے بھارت کے خلاف فوجی اقدامات نہ کرنے کی جو جو بات ہمارے سامنے بیان کیں ان کا ظاہر کرنا آج بھی پاکستان کے منہ میں نہیں ہے۔ اس لئے میں ابھی اس انکشاف سے گریز کرتا ہوں۔



## محاذ رائے شماری سے وابستگی

1964ء کے اوائل میں جب بھارت نے شیخ محمد عبداللہ کو رہا کیا تو انہوں نے تمام

کشمیریوں سے اپیل کی کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں انہیں محاذ رائے شماری میں شامل ہونا چاہیے۔

پاکستان کے تین مختلف شہروں میں تین تنظیمیں اس نام سے وجود میں آچکی تھیں۔ جن میں سے ایک

سیالکوٹ میں تھی جسے میر عبدالرشید نے قائم کیا تھا۔ دوسری پشاور میں خواجہ علی ملک نے قائم کی تھی

اور تیسری تنظیم کراچی میں پیر مقبول شاہ نے بنائی تھی۔ میرے سیاسی نظریات محاذ رائے شماری سے

ملتے تھے۔ لیکن میر عبدالقیوم، میر عبدالمنان اور میں رسمی طور اس نام کی کسی تنظیم میں شمولیت سے

اس لئے احتراز کر رہے تھے کہ اس سے شیخ محمد عبداللہ کی بھارت کے خلاف جدوجہد میں کوئی پیچیدگی

نہ پیدا ہو۔ ان خدشات کو ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے ختم کر دیا۔ جو اپنے والد کے ساتھ پاکستان کے

دورے پر آئے تھے۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے ہمیں بتایا کہ (شیر کشمیر) شیخ محمد عبداللہ چاہتے ہیں

کہ پاکستان میں محاذ رائے شماری قائم کیا جائے اور یہ جماعت بھارتی مقبوضہ کشمیر کے محاذ کی

مماثل COUNTERPART کی حیثیت سے پاکستان میں کام کرے۔ اس یقین دہانی کا حوالہ

میں نے اپنی اس تقریر میں بھی دیا تھا۔ جو ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے اعزاز میں دیئے گئے استقبالیہ

میں ہوٹل میٹروپول میں کی گئی تھی۔ جس میں اور لوگوں کے علاوہ زیڈ۔ ایچ لاری اور مولانا احتشام

الحق تھانوی نے بھی شرکت کی تھی۔ محاذ رائے شماری (برائے آزاد کشمیر و پاکستان) کے قیام کے

سلسلے میں میں نے میر عبدالقیوم اور دوسرے دوستوں کے ساتھ مل کر کام کیا۔ بعد میں ایک موقع پر

جب ڈاکٹر فاروق عبداللہ لندن جاتے ہوئے کراچی ٹھہرے تھے، ہم نے اُن سے محاذ رائے شماری

کے قیام کے بارے گفتگو کی۔ انہوں نے اس خیال کی تائید اور حمایت کی۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو

ہم شیخ محمد عبداللہ کا ترجمان سمجھتے تھے۔

میر عبدالقیوم کی صدارت میں ایک کنونینگ کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے سربراہان کا کام کیا گیا کہ وہ کنونینگ کا اہتمام کرے اور آئینی مسئلہ تیار کرے۔ اس مسئلہ کی تیاری میں میں نے بھی حصہ لیا لیکن میں محاذ کے پہلے کنونینگ میں جو کہ سیالکوٹ میں 3، 4 اپریل 1965ء کو منعقد ہوا، شامل نہ ہو سکا۔ مجھے میری غیر حاضری میں محاذ کا سینئر نائب صدر منتخب کر لیا گیا۔ میں اس کنونینگ میں اس لئے شامل نہ ہو سکا تھا کہ میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ اسی دوران میں نے فریضہ حج بھی ادا کیا۔ حج کے موقع پر میری ملاقات مکہ معظمہ میں شیخ محمد عبداللہ اور مرزا افضل بیگ سے ہوئی۔ میں نے انہیں پاکستان میں محاذ کے قیام کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے اس تجویز کی تائید کی اور میری حوصلہ افزائی کی۔ مجھے معلوم ہوا کہ امان اللہ خاں نے اپنے خطوط میں پہلے ہی انہیں اس بارے میں کافی کچھ بتایا ہوا ہے اور وہ اس بارے میں پوری طرح باخبر اور مطمئن ہیں۔ مرزا افضل بیگ نے جو کہ محاذ کے بانی صدر ہیں، مجھے سمجھایا کہ بعض عملی مشکلات کی وجہ سے ان کے لئے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ محاذ کی پاکستان یا آزاد کشمیر شاخ پر کوئی عملی اور انتظامی کنٹرول رکھ سکیں۔ بنا بریں انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ ہمیں یہاں محاذ کو ایک خود مختار جماعت کی حیثیت سے چلانا چاہئے اور بھارتی مقبوضہ کشمیر کی قیادت سے صرف پالیسی کے عام اور وسیع معاملات میں راہنمائی حاصل کرنا چاہئے۔

پاکستان میں محاذ رائے شماری کے قیام کے وقت سے ہی اس جماعت کو شیر کشمیر اور غیر کشمیر کے بتائے ہوئے خطوط پر چلایا جاتا رہا ہے۔ میں اس تنظیم کا ہمیشہ ایک سرگرم رکن رہا ہوں۔ بہر حال میرے پاس سوائے پہلی بار کے کبھی کوئی عہدہ نہیں رہا۔ میں نے اس تنظیم کی مختلف کمیٹیوں میں کام کیا ہے جن میں وہ رابطہ کمیٹی بھی شامل ہے جس نے حذرتا کہ جنگ کے اس طرف تمام سیاسی جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی۔ میں آج بھی اس تنظیم کے نظریات سے مکمل ذہنی مطابقت رکھتا ہوں۔ میں ان نظریات کو آئندہ بھی اپنائے رکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ جب تک



کہ میرے مادر وطن کی آزادی کے لئے کوئی بہتر متبادل نظر نہ آ جائے۔

## جموں کشمیر قومی محاذ آزادی (JKNLF) سے وابستگی

1965ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد پاکستانی اور کشمیری عوام میں ایک عجیب نفسیاتی تبدیلی واقع ہوئی۔ کشمیری سمجھنے لگے کہ اُن سے دھوکہ کیا گیا ہے اور ان کی تمام قربانیاں رائیگاں گئی ہیں۔ وہ یہ بھی سمجھنے لگے کہ جس قسم کی کمانڈ و سرگرمیاں اس جنگ میں اختیار کی گئی تھیں، کشمیر کی آزادی کے لئے موزوں نہ تھیں۔ دوسری طرف پاکستان کے عوام میں چند مخصوص مفاد پرست عناصر کشمیریوں کے خلاف منافرت پر مبنی بدگمانیوں کی ایک مہم چلانے میں مصروف ہو گئے۔ شکست کی ساری ذمہ داری کشمیریوں پر ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ دوسرے محبت وطن کشمیریوں کی طرح میں بھی اس نفسیاتی تبدیلی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اسی صورت حال کے پس منظر میں اکتوبر 1965ء میں مسٹر مقبول بٹ سے میری ملاقات ہوئی۔ اُنہیں میں 1961ء سے جانتا تھا۔ مسٹر مقبول بٹ کراچی آئے ہوئے تھے اور مسٹر امان اللہ کے ہاں قیام پذیر تھے۔ ہم نے بُری طرح محسوس کیا کہ مادر وطن کی آزادی اور کشمیریوں کے خلاف اس زہریلے پروپیگنڈے کا مقابلہ کرنے کے لئے صرف ایک ہی طریقہ کار گرہو سکتا ہے کہ کشمیری خود اپنے قوت بازو سے وطن کی آزادی کے لئے مسلح جدوجہد کا آغاز کریں۔ میں نے مقبول بٹ سے اس خیال کا اظہار کیا کہ اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ کشمیری کسی بڑی بیرونی امداد کے بغیر صرف اپنے ذرائع سے کشمیر کی جنگ آزادی نہیں لڑ سکتے۔ یہ ایں ہمہ اس طرز کی تحریک شروع کرنے کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اس قسم کی تحریک میں ہر طرح کی امداد دینے کے لئے تیار ہوں۔ مجھے اپنا وہ عہد یاد تھا کہ میں نے سٹیٹ کونسلر کی حیثیت سے حاصل ہونے والی رقم مشاہرہ جنگ آزادی کے لئے وقف کرنے کا اعلان کیا تھا اور میں نے اس وقت ان جذبات کا اظہار بھی کیا تھا کہ کشمیر کو آزاد کرانے کا موثر طریقہ کشمیریوں کو مسلح جدوجہد کے لئے تیار

کرنا ہے۔ جب میں نے مقبول بٹ کے سامنے ان خطوط پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تو انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ اسی مقصد کے حصول کے لئے جموں کشمیر قومی محاذ آزادی کے نام سے ایک تنظیم وجود میں لائی جا چکی ہے اور یہ تنظیم بھارتی مقبوضہ کشمیر میں گوریلا سرگرمیوں کی منصوبہ بندی میں مصروف ہے۔ مقبول بٹ نے مجھے اس تنظیم میں شمولیت کی دعوت دی۔ مجھے میرے اہل قیوم اور امان اللہ خاں کی قومی محاذ آزادی میں شمولیت کے بارے میں بھی علم ہوا اور میری ان سے طویل بحث و تحقیص ہوئی۔ میں نے مسلح جدوجہد کے لئے اپنے نظریات دہراتے ہوئے انہیں بتایا کہ جب تک مجھے اس منصوبہ کے قابل عمل ہونے کا یقین نہ دلایا جائے، میں اس میں شامل نہ ہو سکوں گا۔ قومی محاذ آزادی کے کراچی میں موجود اراکین نے میجر امان اللہ کو کراچی آکر مجھے اس منصوبے کے قابل عمل ہونے کے بارے میں قائل کرنے کی دعوت دی۔ ہماری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ لیکن اپنی کوششوں کے باوجود وہ مجھے اس بات پر قائل نہ کر سکے کہ بھارت جیسی عظیم طاقت کو کسی بیرونی امداد کے بغیر مقامی آبادی محض اپنے ذرائع و وسائل کے بل بوتے پر کشمیر کو خالی کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ علاوہ ازیں میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ جب تک بھارتی مقبوضہ کشمیر کی قیادت کو پہلے سے اعتماد میں نہ لیا جائے۔ مسلح جدوجہد میں باہر سے کسی بڑی امداد کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس کے بعد میں نے قومی محاذ آزادی کے سامنے اپنے تعاون کے لئے یہ شرط رکھی کہ قومی محاذ آزادی کے لئے سب سے پہلا مشن یہ ہونا چاہیے کہ کشمیری عوام کو مسلح جدوجہد کے لئے تیار کرنے کی خاطر وہاں کی قیادت کی اشیر واد حاصل کر لی جائے۔ مجھے یقین دلایا گیا کہ میری شرط منظور کر لی گئی ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنے مشاہرہ کی رقم قومی محاذ کے پہلے مشن کے لئے وقف کر دی۔ میں نے یہ بھی چاہا تھا کہ قومی محاذ آزادی حکومت پاکستان کو بھی اپنے پہلے مشن کے سلسلے میں اعتماد میں لے۔ لیکن اس نکتہ پر مجھے میجر امان اللہ کے اس موقف کو تسلیم کرنا پڑا کہ جب تک کوئی ٹھوس نتائج حاصل نہ کر لئے جائیں اس قسم کی کوشش کو وزارت امور کشمیر سے پیسہ بٹرنے کا ایک بہانہ سمجھا جائے گا۔ میں نے میجر امان



اللہ کے اس خیال کی بھی تائید کی کہ اس قسم کے نازک اور خطرناک مشن کے لئے سرکاری اعتماد حاصل کرنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ مشاہرہ کی دس ہزار روپے کی رقم کے علاوہ میں نے دو ہزار روپے قومی محاذ آزادی کو اس وقت دیئے جب رقم کی کمی کی وجہ سے ایک مشن کی ناکامی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ یہ رقم دینے کے لئے میں اس لئے بھی آمادہ ہو گیا کہ امان اللہ خاں اس مقصد کے لئے اپنے کمرشل انسٹی ٹیوٹ کو فروخت کرنے پر تیار ہو گئے تھے۔

جون 1966ء میں مجھے اطلاع دی گئی کہ مشن مقبوضہ کشمیر کے لئے روانہ ہو چکا ہے۔ امان اللہ خاں نے مجھے بتایا کہ انہیں ان مشن کی کارروائیوں کے بارے میں وقتاً فوقتاً اطلاعات ملتی رہتی ہیں۔ میں نے کبھی تفصیلات میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ستمبر 1966ء میں میں نے آل انڈیا ریڈیو ریڈیو کشمیر سے یہ خبر سنی کہ مقبول بٹ گرفتار ہو گئے ہیں۔ ان کی گرفتاری کے بعد بھارت نے قومی محاذ آزادی کے اس مشن میں پاکستان کی حکومت کے ملوث ہونے کا شد و مد (سے) پروپیگنڈا شروع کر دیا تھا۔ اس پروپیگنڈا کا توڑ کرنے اور حکومت پاکستان کو پریشانی سے بچانے کے لئے ہم سب نے امان اللہ خاں کو ہدایت کی کہ وہ ایک اخباری بیان کے ذریعے قومی محاذ آزادی کے وجود کا اعلان کریں اور بھارتی مقبوضہ کشمیر میں کی جانے والی کارروائیوں کی پوری ذمہ داری قبول کریں۔

بھارتی مقبوضہ کشمیر سے فرار اور آزاد کشمیر میں نظر بندی سے رہائی کے بعد میجر امان اللہ خاں کراچی میں میرے پاس پھر آئے اور میرے سامنے یہ تجویز رکھی کہ قومی محاذ آزادی کی کارروائیاں پھر سے شروع کی جائیں۔ میں نے ایسا کرنے سے معذوری کا اظہار کیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ مقبول بٹ اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو بھارت کے پنجے سے چھڑانے کے لئے ہر قسم کی امداد دینے کو تیار ہوں۔ اس کے بعد میں قومی محاذ آزادی کی عملی کارروائیوں سے لاتعلق رہا ہوں۔

میں ایک غلط فہمی دُور کرنے کے لئے یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ 1967ء کے بعد میرا قومی محاذ آزادی کی طرف کیا رویہ رہا۔ میں نے کبھی قومی محاذ آزادی کی مخالفت نہیں کی اور نہ کبھی ایسا کروں گا۔ میں اس تنظیم کو محبت وطن افراد کی ایک تنظیم سمجھتا ہوں اور اس تنظیم کے جن ارکان کے ساتھ مجھے ملنے کا فخر حاصل ہوا ہے۔ وہ منفرد خوبیوں کے حامل اور اعلیٰ کردار کے مالک ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ ان میں سے ہر شخص ایک ہیرو کی حیثیت رکھتا ہے جن پر کشمیری قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قومی محاذ آزادی کی کامیابیوں یا ناکامیوں سے قطع نظر اس تنظیم نے تاریخ میں کشمیر کے وقار کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ میں اپنے اس نظریئے پر قائم ہوں کہ مسلح جدوجہد ہی ایک ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعے کشمیری قوم اپنے لئے حق خود ارادیت حاصل کر سکتی ہے۔ اس طرح سے میں مادر وطن کی آزادی کے لئے قومی محاذ آزادی کے مسلح جنگ کے موافق کی پوری پوری حمایت کرتا ہوں۔ چاہے مجھے پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ میرے اس نظریئے میں فرق نہیں آئے گا۔ اگر ضرورت پڑی تو میں اس مقصد کے حصول کے لئے تختہ دار پر بھی لٹک جاؤں گا۔ تاکہ دنیا دیکھ سکے کہ کشمیری اتنے بزدل نہیں ہیں کہ وہ اپنی جانیں بچانیں کے لئے اپنے عقائد و نظریات کو چھپاتے پھریں۔ اگر اپنی مادر وطن سے محبت کی سزا موت ہو سکتی ہے تو میں ایسی موت کو مسکراتے ہوئے گلے لگاؤں گا۔

بھارتی طیارہ گنگا کی ہائی جیکنگ اور اُس کے جلانے میں میرا کردار

میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ میں بھارتی مقبوضہ کشمیر میں مقبول بٹ کی گرفتاری کے بعد جموں کشمیر قومی محاذ آزادی کی کارروائیوں سے لا تعلق ہو گیا تھا۔ مجھے ہائی جیکنگ کے بارے میں اس تنظیم کے کسی منصوبہ یا اوپریشن کا کوئی علم نہیں تھا۔

بھارتی جہاز کے اغواء کے بارے میں مجھے پہلی بار اُس وقت علم ہوا۔ جب ہفتہ

30 جنوری 1971ء کو دو بجے کے قریب میر عبد المنان نے مجھے بتایا کہ انہیں راولپنڈی سے ایک



چونکا دینے والی خبر ملی ہے کہ دو کشمیری نوجوانوں نے ایک بھارتی جہاز اغواء کیا ہے اور انہوں نے یہ الٹی میٹم دیا ہے کہ اگر اُن کے مطالبے منظور نہ کئے گئے تو وہ جہاز کو تباہ کر دیں گے۔ ان واقعہ کے بارے میں میرمنان صاحب کی معلومات بھی نامکمل اور معمولی تھیں۔ بہر حال انہوں نے مجھ سے مشورہ مانگا کہ اس معاملے میں کیا کیا جائے۔ میں اس وقت غیر ملکی خریداروں کے ساتھ مصروف تھا۔ چنانچہ میں نے میرمنان صاحب کو بتایا کہ میرا فوری ردِ عمل یہ ہے کہ کوشش کی جانی چاہیے کہ جہاز کے مسافروں اور عملے کی جانوں کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ مجھے اس بارے میں کوئی مشورہ دینے کا حق نہیں اور قومی محافظ آزادی کی لیڈر شپ کو اس صورتحال سے مناسب طور پر عہدہ برآ ہونا چاہیے۔ اس روز میں غیر معمولی طور پر مصروف تھا۔ چنانچہ میں کاروباری معاملات میں رات گئے تک اپنے کارخانہ میں ہی مصروف رہا۔

شام کو جب میں گھر پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ میر عبدالقیوم اور میر عبدالمنان نے پیغام دیا ہے کہ میں انہیں ان کے گھر پر ملوں۔ چنانچہ میں میر عبدالمنان کے گھر گیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہاں کراچی کے بیشتر سرکردہ کشمیری جمع ہو چکے تھے اور وہ ہائی جیکنگ کے بارے میں تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ جو لوگ اُس وقت وہاں موجود تھے، مجھے اُن میں سے خواجہ محمد صدیق بابا اور خواجہ عطاء اللہ کے نام یاد ہیں۔ کچھ لوگوں کے لاہور جانے کا ذکر ہو رہا تھا۔ میر عبدالقیوم نے ارادہ ظاہر کیا کہ وہ بھی دوسرے دن لاہور جائیں گے جیسا کہ میں نے اپنے دفعہ 342 کے بیان میں بتایا ہے۔ ان ایام میں میری بہن اور ان کے بچے لاہور میں میرے چھوٹے بھائی غلام نبی لون کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ لوگ سرینگر سے آئے تھے اور چونکہ میں نے انہیں گزشتہ 15 سال سے نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے میں پہلے ہی لاہور جانے کا ارادہ کئے بیٹھا تھا۔ میر عبدالقیوم کے کہنے پر میں نے اپنے پروگرام میں کچھ ترمیم کی اور دوسرے دن اس کے ساتھ ہی لاہور چلا آیا۔ ہم اتور 31 جنوری 1971ء کو صبح کے تقریباً نو بجے لاہور پہنچے۔

جب ہم لاہور کے ہوائی اڈے پر پہنچے تو وہاں کوئی خاص ہلچل نہ تھی۔ ہم کریسنٹ پلسٹی سروس کے دفتر گئے اور شیخ عبدالرحمن سے مختلف خبر رساں ایجنسیوں کو ٹیلیفون کرا کے ہائی جیکرز اور اغواء شدہ جہاز کے بارے میں تازہ ترین صورت حال معلوم کرنا چاہی۔ گیارہ بجے کے قریب ہم لاہور کے ہوائی اڈے پر واپس پہنچے۔ مظاہرین کی ایک بہت بڑی تعداد جمع ہو چکی تھی۔ میں نے وی۔ آئی۔ پی روم میں کئی سرکردہ سیاسی شخصیتیں موجود پائیں۔ جن میں کے۔ ایچ خورشید اور غلام حسین کرمانی وغیرہ شامل تھے۔ کسی نے ہمیں بتایا کہ مقبول بٹ ایئر پورٹ پر آئے تھے۔ ہم نے چیف سیکرٹری کے گھر رابطہ پیدا کرنا چاہا۔ لیکن ہمیں کوئی جواب نہیں ملا۔ اس دوران مشتعل مظاہرین پر لائنھی چارج ہو چکا تھا جس کی زد میں کے۔ ایچ خورشید صاحب بھی آچکے تھے۔ انہوں نے اور ڈپٹی کمشنر نے عوام کو مطمئن کرنے کے لئے ان سے خطاب بھی کیا تھا۔ تقریباً اسی وقت ڈاکٹر مبشر حسن سے میرا تعارف کرایا گیا جنہوں نے ہمیں بتایا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر بھٹو سے انہوں نے رابطہ قائم کیا تھا اور بھٹو صاحب نے قومی محاذ آزادی کی لیڈر شپ کو یہ پیغام بھجوایا تھا کہ جہاز کے مسافروں اور جہاز کی واپسی کے سلسلہ میں سخت رویہ پاکستان کے قومی مفاد میں ہوگا۔ انہوں نے چیئرمین بھٹو کی یہ رائے بھی ہم تک پہنچائی کہ کشمیریوں کو ہندوستانی تسلط کے خلاف اپنی جدوجہد کو بین الاقوامی سطح پر اجاگر کرنے کا ایک نادر موقعہ مل گیا ہے اور اب انہیں اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانے سے ہچکچانا نہیں چاہیے۔ ہم نے ڈاکٹر مبشر حسن کو یقین دلایا کہ ہم ان کا پیغام مقبول بٹ تک پہنچا دیں گے۔

میر عبدالقیوم، شیخ عبدالرحمن اور میں بارہ بجے کے قریب چیف سیکرٹری کے گھر گئے۔ جس وقت ہم وہاں پہنچے چیف سیکرٹری اور مقبول بٹ کی بات چیت ختم ہو چکی تھی۔ صرف غیر رسمی بات چیت جاری تھی جس میں ہم بھی شامل ہو گئے۔ اس بات چیت کے دوران میں نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا کہ قومی محاذ آزادی کا یہ مطالبہ کہ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں محبوس، اُن کے 36 ساتھیوں کو رہا



کر دیا جائے۔ بھارتی حکومت منظور نہیں کرے گی۔ جہاں تک جہاز تباہ کرنے کی دھمکی کا تعلق ہے چونکہ جہاز کسی غیر ملکی کمپنی کے پاس بیہ شدہ ہوگا۔ اس لئے اس کے جلنے سے بھارتی حکومت کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ بنابر میں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ کوئی ایسا طریق کار اختیار کیا جائے جس سے قومی محافظ آزادی کے مسلح جدوجہد کے موء قف کو تقویت ملے اور ساتھ ہی ساتھ اس سے بین الاقوامی طور پر پاکستان کے لئے کوئی مشکل صورتحال پیدا نہ ہو۔ میں نے تجویز کیا کہ قومی محافظ آزادی جہاز کو حکومت پاکستان کے حوالے کرے تاکہ وہ اس کے بارے میں کوئی مناسب فیصلہ کرے۔ چیف سیکرٹری نے کہا کہ ان کی بنیادی ذمہ داری جہاز کے مسافروں کی رہائی اور تحفظ ہے جس کے لئے ان پر مختلف حلقوں کی طرف سے دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ اس سوال پر کہ جہاز کا کیا کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ حکومت اس معاملے میں اتنی ہی ناتجربہ کار ہے جتنا کہ قومی محافظ آزادی۔ یہ ساری بات چیت غیر رسمی طور پر ہوتی رہی اور کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی۔ اس کے بعد چیف سیکرٹری نے ہمارے سامنے ہی پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کے کسی افسر کو مقبول بٹ کے لئے پارک لگژری ہوٹل میں اسی شام پریس کانفرنس کا انتظام کرنے کی ہدایت کی اور خود مقبول بٹ کو ساتھ لے کر کھانا کھانے چلے گئے۔

میر قیوم، شیخ رحمن اور میں غلام نبی لون کے گھر کھانا کھانے چلے گئے جہاں ہم چار بجے تک ٹھہرے رہے۔ اُس کے بعد ہم مقبول بٹ کی پریس کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے پارک لگژری ہوٹل چلے گئے۔ وہاں سے ہم لوگ دوبارہ چیف سیکرٹری کی رہائش گاہ پر چلے گئے۔ مقبول بٹ چیف سیکرٹری کے ساتھ بات چیت کرتے رہے اور ہم باہر انتظار کرتے رہے۔ جب وہ دونوں باہر آئے تو تقریباً اندھیرا ہو چکا تھا۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ اس طویل بات چیت میں بھی کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکا۔ اس کے بعد مقبول بٹ نے چیف سیکرٹری سے ایئر پورٹ جا کر ہائی جیکرز سے ملاقات کی اجازت مانگی۔ چیف سیکرٹری نے کسی شخص کو ”میجر صاحب“ کے نام سے مخاطب کرتے

ہوئے ہمارے ساتھ ایئر پورٹ جانے کی ہدایت کی۔ یہی موقعہ تھا جب میری ہاشم قریشی سے پہلی ملاقات ہوئی۔ ہاشم قریشی اس وقت جہاز کے باہر کھڑے تھے اور اشرف قریشی کاک پٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چونکہ اندھیرا گہرا تھا اس لئے میں دونوں ہائی جیکرز کی شکلیں بھی ٹھیک طرح سے نہیں دیکھ سکا۔ اس وقت وہاں پندرہ بیس افراد اور بھی موجود تھے جن میں ڈپٹی کمشنر اور ایس۔ ایس۔ پی شامل تھے۔

ہائی جیکرز سے اس مختصر ملاقات کے بعد مقبول بٹ اور ان کے ساتھی ہوٹل انٹرنیشنل چلے گئے جہاں حکومت نے ان کی رہائش کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ میں رات گزارنے کے لئے اپنے بھائی غلام بنی لون کے گھر آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ میرے بھائی کے گھر میری ہمیشہ اور ان کے بچوں کے ٹھہرنے کی وجہ سے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے ہوٹل انٹرنیشنل میں کمرہ بک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے یہ کمرہ رات کو بہت دیر سے بک کر لیا اور میں وہاں گیارہ بجے رات پہنچا۔ یکم فروری 1971ء کی صبح کو میرا قیوم، مقبول بٹ، ڈاکٹر فاروق حیدر اور میں نے ناشتا کھٹے ہی کیا اور ہم چیف سیکرٹری کے گھر بھی اکٹھے ہی گئے۔ اس وقت چیف سیکرٹری کے ہاں مسٹر آفتاب احمد اور ارباب مختار احمد بھی موجود تھے۔ مکان کے پورچ میں انہوں نے مقبول بٹ اور ڈاکٹر فاروق حیدر کے ساتھ کچھ مشورہ کیا۔ کچھ دیر بعد میرا قیوم کو اور مجھے اس مشاورت میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔

اس بات چیت کے دوران میں نے ایک بار پھر یہ تجویز رکھی کہ قومی محاذ آزادی کو چاہیے کہ جہاز کو حکومت پاکستان کے حوالے کر دے۔ یہ تجویز میں ایک دن قبل بھی پیش کر چکا تھا۔ میں نے چیف سیکرٹری سے خاص طور پر سوال کیا کہ ”کیا حکومت جہاز کو واپس بھیجنا چاہتی ہے؟“ میں نے کہا اگر حکومت جہاز کو بھارت واپس بھیجنا چاہتی ہے تو بہترین صورت یہ ہوگی کہ مقبول بٹ ایک اخباری بیان میں اعلان کریں کہ ہم پاکستان سے اپنی عقیدت کی علامت کے طور پر جہاز کو حکومت



پاکستان کے حوالے کرتے ہیں۔ قومی محاذ آزادی کے وقار کو بچانے کی خاطر اس بیان میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جہاز کے اس اغواء سے بھارت کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں اور اگر بھارت نے کشمیر پر اپنا تسلط اسی طرح جاری رکھا تو این۔ ایل۔ ایف اس سے بھی شدید تر ضرب لگانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ مقبول بٹ نے چیف سیکرٹری اور دوسرے آفیسرز کی موجودگی میں اس تجویز پر رضامندی ظاہر کی۔ لیکن آفتاب احمد سمیت کسی افسر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میری تجویز کے جواب میں انہوں نے صرف اتنا کہا کہ ان کی اصل ذمہ داری جہاز کے مسافروں کی جانوں کا تحفظ تھا۔ چنانچہ یہ بات چیت بھی کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی۔

چیف سیکرٹری کی رہائش گاہ سے ہم لوگ مسٹر بھٹو سے ملنے سیدھے فلیٹینر ہوٹل گئے۔ مسٹر بھٹو نے اس بات پر نکتہ چینی کی کہ ہائی جیکرز نے جہاز کے عملے اور مسافروں کو کیوں اترنے دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ سودا بازی کے لئے جو طاقت این۔ ایل۔ ایف کے ہاتھ آگئی تھی۔ اسے مسافروں کو اپنی حراست سے رہا کرنے کی وجہ سے کمزور کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک جہاز کی واپسی کا تعلق تھا، بھٹو صاحب نے زور دار الفاظ میں ہمیں ہدایت کی کہ جہاز کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑنا چاہیے۔ انہوں نے بار بار اس بات کو دہرایا کہ اگر یہ جہاز واپس چلا گیا تو پاکستان کے مفاد کو بھی زک پہنچے گی اور کشمیر کی تحریک آزادی کو بھی نقصان پہنچے گا۔ بھٹو صاحب نے مقبول بٹ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ جس ہوٹل میں مسافروں کو ٹھہرایا گیا ہے۔ اس کا ”گھیراؤ“ کیا جاسکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے پیپلز پارٹی کے رضا کاروں کی پیشکش بھی کی۔ ساتھ ہی انہوں نے ہمیں یہ ہدایت بھی کی کہ بھارتی مسافر کو کوئی گزند نہیں پہنچنی چاہیئے اور نہ کسی کی کوئی توہین ہونی چاہیئے۔ کیونکہ اس طرح سے بین الاقوامی رائے عامہ پر بُرا اثر پڑے گا۔ ”گھیراؤ“ کا مقصد مسافروں کو اس وقت تک روکنا چاہیئے۔ جب تک بھارت قومی محاذ آزادی کا مطالبہ منظور نہ کرے۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ اگر این۔ ایل۔ ایف نے بھارت کو عوام کی نظروں میں پسائی پر مجبور کر دیا تو اس سے

این۔ ایل۔ ایف کی مقبولیت میں بے حد اضافہ ہو جائے گا۔ انہوں نے ڈاکٹر مبشر حسن کو ہدایت کی کہ ہوٹل ایمپسڈر کا گھیراؤ کرنے کیلئے ضروری اقدامات کریں۔ لیکن ابھی یہ ہدایات دیئے کچھ دیر ہی گزری تھی کہ ہم تک یہ خبر پہنچ گئی کہ بھارتی مسافروں کو سرحد پار بھیج دیا گیا ہے۔ ہم سب اس بات کی تصدیق کرنے ہوٹل ایمپسڈر پہنچے تو ہمیں معلوم ہوا کہ خبر درست تھی۔ اس کے بعد میں ہوٹل انٹرنیشنل گیا اور میں نے کمرہ چھوڑ دیا۔ دن کا باقی حصہ دوستوں سے ملنے، کاروباری مصروفیات اور لاہور میں اپنے کارخانے کے معائنہ میں صرف ہوا۔ رات کا کھانا کھانے کے لئے میں سات بجے شام اپنے بھائی کے گھر پہنچا۔ ساڑھے آٹھ بجے شب میں شیخ غلام محی الدین اور اپنے بھائی کے ہمراہ ایئر پورٹ پر پہنچا۔ شیخ صاحب نے بھی کھانا ہمارے ساتھ ہی کھایا تھا۔ اس کے بعد میں ہوائی جہاز سے کراچی روانہ ہو گیا۔ اس طرح سے میں نے کسی ایسی مینٹنگ میں حصہ نہیں لیا۔ جس کے بارے میں استغاثہ نے یہ الزام لگایا ہے کہ اغواء شدہ جہاز کو جلانے کا فیصلہ اسی مینٹنگ میں کیا گیا تھا۔ جہاز کی تباہی کے وقت بھی لاہور میں موجود نہیں تھا۔

جہاز کے جل جانے کے بعد میر عبد المنان نے ایک بار پھر مجھ سے میری رائے اس بارے میں طلب کی کہ شیخ مجیب الرحمن اور ماسٹر خان گل نے جہاز کو جلانے کے واقعے کی تحقیقات کا جو مطالبہ کیا ہے اس پر ہمارا ردِ عمل کیا ہونا چاہیے۔ میں نے مشورہ دیا کہ اس مطالبہ کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے۔ میں نے یہ بھی تجویز کیا کہ اس سلسلہ میں یہ پیشکش کی جانی چاہیے کہ ہم بین الاقوامی ججوں پر مشتمل ایک کمیٹی سے تحقیقات کرانے پر تیار ہیں جن کا تعلق افریقہ و ایشیائی ممالک سے ہو اور جنہیں پاکستان اور ہندوستان دونوں منظور کر لیں۔ میر عبد المنان نے محاذ رائے شماری کی طرف سے اس سلسلے میں پریس کو ایک بیان جاری کیا جو انہی خطوط پر تھا۔

ہائی جیکرز سمیت این۔ ایل۔ ایف کے کارکنوں کی گرفتاری کی اطلاع مجھے اخبارات کے ذریعہ ملی۔ مجھے یہ جان کر سخت صدمہ ہوا کہ یحییٰ خاں کی کوتاہ نظر حکومت نے کشمیر کی آزادی کے



لئے پہلی مسلح جدوجہد کی تحریک کو کچلنے کی کوشش کی ہے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ کشمیر کی تاریخ کے ایک سیاہ دور بلکہ سیاہ ترین دور کا آغاز ہو گیا ہے۔

یہی خاں کی حکومت نے سرکاری سطح پر پریس کے ذریعہ گمراہ کن پروپیگنڈہ کی مہم شروع کر دی۔ مقامی اُردو روزناموں میں اس قسم کی خبریں شائع کرائی گئیں۔ ہائی جینگ کی پشت پر بڑے بڑے کشمیری تاجر ہیں۔ اس طرح میدان ہموار کرنے کے بعد مجھے 28 اپریل 1971ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ تحقیقات کے دوران مجھے پولیس نے جس ظالمانہ تشدد کا نشانہ بنایا اس کے بارے میں میں نے اُردو میں الگ بیان قلمبند کیا ہے۔

مجھے اپنی جگہ پختہ یقین ہے کہ یہی خاں کی حکومت کو قومی محاذ آزادی اور اس میں شامل افراد کے کردار کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا۔ مجھے تو یوں نظر آتا ہے کہ ہم لوگوں کو اس طرح بھیانک تشدد کا نشانہ بنانے کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ ہمیں آزادی کشمیر کے بارے میں مثبت اور حقیقی اقدام کرنے کی ایسی ”سزا“ دینے کی مثال قائم کی جائے کہ دوبارہ کسی کشمیری کو ایسی ”حرکت“ کرنے کی جرات نہ ہو۔ یہی خاں کشمیریوں کے اس جذبے کا سرکھٹا چاہتا تھا کہ وہ اپنے وطن کو مسلح جدوجہد کے ذریعے اپنے ہاتھوں آزاد کرائیں گے۔ وہ اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہے صرف تاریخ ہی بتا سکتی ہے۔

## ایس۔ این ڈر کے وزیٹنگ کارڈ کے بارے میں وضاحت

میرے پرانے کاروباری کاغذات میں سے پولیس نے ایس۔ این ڈر کا ایک وزیٹنگ کارڈ بھی قبضے میں لے لیا تھا۔ مذکورہ کارڈ کے ساتھ کاغذ کا ایک پرچہ لگا ہوا تھا جس میں ”کاشان“ قالینوں کے ایک جوڑے کے بارے میں رنگ اور سائز کی تفصیلات درج تھیں۔ ”کاشان“ قالینوں کے ایک مخصوص ڈیزائن کا نام ہے۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران میں نے پولیس کے کاغذات میں کارڈ کے ساتھ نتھی کی ہوئی متذکرہ پرچی اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ پولیس کے

تیار کردہ ”مشیر نامہ“ میں بھی قالینوں کے نمونے کے بارے میں متذکرہ پرچی کا اندراج موجود ہے۔ لیکن اب پولیس نے دیدہ و دانستہ اسے ریکارڈ میں سے غائب کر دیا ہے۔ اس پرچی سے وہ مقصد عیاں ہوتا تھا جس کے لئے متذکرہ وزٹنگ کارڈ میرے پاس پڑا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ پرچی میں دیئے گئے نمونہ کے ”کاشان“ مہیا کئے جائیں کیونکہ وہ اس وقت سٹاک میں موجود نہ تھے۔ میں عدالت کی توجہ زیر بحث وزٹنگ کارڈ کی برآمدی کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل متعلقہ حقائق کی جانب دلانا چاہتا ہوں۔

1۔ میرے پاس اس قسم کے سیکڑوں وزٹنگ کارڈ موجود رہے ہیں۔ جس وقت پولیس نے متذکرہ کارڈ اپنے قبضے میں لیا تھا اس وقت بھی اس کے ساتھ بیسیوں دوسرے کارڈ پڑے ہوئے تھے۔ قالینوں کے خریدار عموماً معاشرے کے اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں اور ان کے پاس وزٹنگ کارڈ ہونا ایک عام بات ہے۔ میری یہ عادت رہی ہے کہ میں کاروباری تفصیل وزٹنگ کارڈوں کی پشت پر یا اس سے منسلک ایک پرچے پر لکھ لیا کرتا تھا اور اس کے بعد ان کارڈوں کو اپنے ریکارڈ میں رکھتا تھا۔ اس طرح سے مطلوبہ قسم کا قالین دستیاب ہونے پر خرید و فروخت کے لئے یہ تفصیل بہت مفید رہتی تھیں۔

2۔ میری یہ عادت رہی ہے کہ کاروبار سے متعلق دستاویزات، ان کا فوری افادہ ختم ہونے کے بعد بھی ریکارڈ میں رکھا کرتا ہوں۔ اپنی اس عادت کے ثبوت کے طور پر میں پولیس کے ریکارڈ سے 37 پونڈ کا ایک چیک پیش کرتا ہوں۔ یہ چیک ایک مصری سفارتی نمائندے نے میرے نام جاری کیا تھا۔ بعد میں انہوں نے ادائیگی نقد کر دی تھی اور اس طرح ظاہر ہے کہ یہ چیک بیکار ہو گیا تھا لیکن پھر بھی ریکارڈ میں پڑا رہا۔ اس طرح ایک اور کاغذ ایگزٹ ایس/ڈبلیو 2/6 ہے۔ جو کہ ایک آسٹریلوی باشندے مسٹر باکرنے جو ادویات کی ایک کمپنی کے منظم اعلیٰ ہیں، اپنے مطلوبہ قالین کے سائز اور ڈیزائن کی تفصیل لکھ کر مجھے دیا۔ متذکرہ ہر دو دستاویزات میں اپنے اس بیان



کے ساتھ شامل کر رہا ہوں۔

3۔ جس وقت میرے گھر کی تلاشی ہوئی پولیس نے یہ طریق کار اختیار کیا کہ تمام دستاویزات اور دیگر اشیاء کو ایک جگہ جمع کیا پھر ان میں سے کچھ کاغذات کو منتخب کر کے فردِ مضبوطی میں درج کر لیا۔ اس طرح 'مشیران' کو جائے برآمدگی کا کچھ علم نہ ہو سکتا تھا۔ جہاں یہ چیزیں پولیس کی تلاشی سے پہلے رکھی ہوئی تھیں۔

4۔ میرے پاس کوئی کار نہیں ہے۔ وہ گاڑی جو تلاشی کے وقت گیراج میں موجود تھی، ایک سٹیشن وگن ہے جس کا نمبر KAK8502 ہے۔ جیسا کہ پولیس رجسٹریشن EXD8/6/3 سے ثابت ہوتا ہے۔ اس گاڑی میں ایسی کوئی ڈنگی نہیں ہے جس کا ذکر "مشیر" نے کیا ہے۔ عملی طور پر وزٹنگ کار ڈجیسے کاغذ کا میری سٹیشن وگن میں پایا جانا ناممکن ہے۔ بنا بریں متذکرہ وزٹنگ کار ڈکی برآمدگی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ایس۔ این ڈریا بھارتی سفارت خانے کے کسی رکن سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس قسم کے کسی تعلق کا الزام بالکل بے معنی ہے۔

## سیاسی نظریہ

میں کشمیری عوام کے حق خود ارادیت میں یقین رکھتا ہوں۔ میرا نظریہ ہے کہ ہم کشمیریوں کو اپنی مادرِ وطن کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا مکمل اور ناقابلِ تمنیخ حق حاصل ہے۔ دوسرے الفاظ میں میں سمجھتا ہوں کہ کشمیریوں کے سامنے اپنی ریاست کے سیاسی مستقبل کے لئے تمام راستے کھلے ہیں، چاہے کچھ بھی ہو جائے میں اپنے اس موقف سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ میرا یہ بھی ایمان ہے کہ ریاست جموں کشمیر ایک ناقابلِ تقسیم علاقائی وحدت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں حدِ متار کہ جنگ کے تقدس کو ماننے سے انکار کرتا ہوں۔ اسی بنا پر میں گلگت بلتستان کو ریاست جموں کشمیر کا ایک حصہ سمجھتا ہوں۔ میں اپنی مادرِ وطن کی تقسیم کو کبھی قبول نہیں کروں گا۔ میں

اپنی مادر وطن کی بتدریج قطع و برید کو کبھی برداشت نہیں کروں گا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے کسی بہانے سے بھی اس بات پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ مجھے اپنے وطن کے کسی حصے سے محروم کر دیا جائے۔ میں ہمیشہ مسئلہ کشمیر کو ریاست جموں کشمیر کے ساتھ لاکھ انسانوں کے حق خود ارادیت کے مسئلے کی بجائے علاقائی تنازعہ قرار دینے والوں کی مخالفت کرتا رہوں گا۔ میں اپنے آخری سانس تک ”کشمیر کشمیریوں کا ہے“ کا نعرہ بلند کرتا رہوں گا۔

میں کشمیریوں کے اس پیدائشی حق پر یقین رکھتا ہوں کہ انہیں اپنے وطن کو بھارتی تسلط سے آزاد کرانے کے لئے مسلح جدوجہد کا حق حاصل ہے۔ میں اقوام متحدہ کی کسی ایسی قرارداد کو تسلیم نہیں کرتا جو اس حق کی نفی کرتی ہو۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ کشمیریوں کو اپنی تحریک مزاحمت کو کامیاب بنانے کے لئے پاکستانی عوام اور دنیا کے دیگر آزادی پسند عوام کی حمایت کی ضرورت ہے۔ ان جیالے کشمیریوں کے لئے میرے دل میں عزت و احترام اور ہمدردی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ آزادی وطن کے لئے اپنے بازوؤں پر بھروسہ کرتے ہوئے خود کفیل جدوجہد ممکن ہے۔ میں انہیں سلام کرتا ہوں اور ہمیشہ ان کی مدد کو کمر بستہ رہوں گا۔ حق خود ارادیت کے اصول کے ساتھ میری وابستگی کسی اور شخص کی اس اصول کے ساتھ وابستگی کی مرہونِ وقت نہیں ہے۔ اگر میں اس اصول کے لئے یکہ و تنہا بھی رہ جاؤں، تب بھی میرے موہِ وقف میں تبدیلی نہ آئے گی۔





## حصہ دوم

جناب والا!

اس معزز عدالت کے سامنے مجھے اور میرے محب وطن ساتھیوں کے خلاف جو جھوٹا مقدمہ زیر سماعت ہے اور جو بے بنیاد اور گھناؤنے الزامات ہم لوگوں پر لگائے گئے ہیں، اُن کا پس منظر پولیس کی حراست میں دوران تفتیش اور بعد میں آنے والے حالات نے مجھ پر منکشف کیا ہے۔ ہر گزرنے والا دن یحییٰ خاں اور اُن کی فوجی جنتا کی غدار یوں، سیاہ کاریوں اور ہوس اقتدار کو تسکین دینے کے لئے ان کی گونا گوں سازشوں کا پردہ چاک کرتا جا رہا ہے۔ وہ دن جلد آنے والا ہے جب سارے راز ہائے دور و ن پردہ عوام کے سامنے آ جائیں گے اور پھر دنیا دیکھ لے گی کہ ایک آمر مطلق نے محض اپنی حکمرانی کو دوام بخشنے کے لئے کن کن ذلیل ہتھکنڈوں سے کام لیا۔

جناب والا!

قومی محاذ آزادی اور محاذ رائے شماری کے کارکنوں کے خلاف ملک گیر پیمانے پر گرفتاریوں، خانہ تلاشیوں اور اس کے انسانیت سوز تشدد کا کوئی جواز نہ تھا۔ اس سارے کیس کی بنیاد ہی جھوٹ پر رکھی گئی ہے۔ حکومت کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہ تھا۔ 28 اپریل 1971ء کی ملک گیر خانہ تلاشیوں کے نتیجے میں بھی پولیس کو کئی ایسا مواد نہ ملا جس سے ہمارے خلاف الزامات کو تقویت ملتی۔ چنانچہ الزامات کو ”ثابت“ کرنے کا واحد ذریعہ پولیس کے پاس تشدد ہی باقی رہ گیا تھا۔ اس ذریعہ کو پولیس نے کمال چابکدستی اور مہارت سے استعمال کیا۔ ہم لوگ سخت جان تھے کہ اس صبر آزما اور جان لیوا امتحان میں سے زندہ و سلامت نکل آئے لیکن اس انسانیت سوز تعذیب و تشدد اور بلیک میلنگ کے اثرات ہمارے جسموں اور دل و دماغ پر تادیر قائم رہیں گے۔

میں اس موقع پر فاضل عدالت کے نوٹس میں وہ واقعات تفصیلاً لانا چاہتا ہوں جو

28 اپریل 1971ء کے بعد میرے اور میرے ساتھیوں کے ساتھ پیش آئے جن کے نتیجے میں پولیس میرے چند قابل قدر ساتھیوں سے جھوٹے "اقبالی بیانات" حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اگرچہ ان اقبالی بیانات کی قلمی اس عدالت میں اچھی طرح کھل چکی ہے اور پولیس نے ہمارے ایک عزیز ساتھی کو سلطانی گواہ بنانے کے لئے جو مذموم ہتھکنڈے استعمال کئے تھے۔ ان سے بھی کسی حد تک پردہ اٹھ چکا ہے۔

میری گرفتاری 28 اپریل 1971ء کو علی الصبح عمل میں آئی۔ صبح کے پانچ بجے ڈی۔ ایس۔ پی ظہور خاں مع دیگر بارہ افسران کے میرے سونے کے کمرے میں گھس آیا۔ میری بیوی کو جلدی میں اپنی بچی کے پلنگ کی چادر سے سر ڈھانپنا پڑا۔ مجھے بسترے سے اٹھتے ہی ڈی۔ ایس۔ پی نے بغیر کوئی وارنٹ دکھائے حراست میں لے لیا۔ کسی لیڈی کانشیبل کی غیر موجودگی میں گھر کی خواتین سے تلاشی لی گئی۔ میری بہن اور اسکی جواں سال بیٹی کو بھی جو گھر میں موجود تھیں، کو بے پردہ کر کے تلاشی لی گئی۔ میری بہن کے دیور اور بیٹے کو بھی جو مقبوضہ کشمیر سے پاسپورٹ پر آئے ہوئے تھے، حراست میں لے لیا گیا تھا۔ یہ وہ افراد تھے جنہوں نے کشمیر میں پولیٹیکل کانفرنس کی زیر قیادت پاکستان کے لئے جیلیں کاٹی تھیں اور جنہوں نے حسینی والا باڈر سے پاکستانی علاقے میں داخل ہوتے وقت اس ارض پاک کی مٹی کو اپنے ہاتھ میں لے کر چوما تھا۔ گرفتاری کے بعد میری ان عزیزوں سے کبھی ملاقات تک نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ وہ واپس چلے گئے۔

میرے گھر اور دکان کی تلاشی کے بعد مجھے کراچی سی۔ آئی۔ اے کے دفتر پہنچایا گیا۔۔۔۔۔ جہاں مجھے اسپیشل پولیس کے سپرنٹنڈنٹ آغا سلطان کی تحویل میں دیا گیا۔ سی۔ آئی۔ اے کے دفتر پہنچنے پر میں نے دیکھا کہ ہماری جماعت کے کچھ ارکان کو مجھ سے پہلے ہی گرفتار کر کے لایا گیا تھا اور کچھ لائے جا رہے تھے۔ گرفتار شدگان میں میر عبد القیوم، میر عبد المنان، میر ہدایت اللہ، خواجہ محمد صدیق بابا، خواجہ غلام محی الدین بانکا، محمد مقبول نانیک، خواجہ محمد یوسف قریشی اور کئی دیگر



ارکان شامل تھے، جن میں سے پندرہ، سولہ سال کے دو تین بچے بھی تھے۔ سی۔ آئی۔ اے دفتر میں مجھے ایس۔ پی آغا سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ مجھے خیال نہ رہا اور میں پہلے سے سلگایا ہوا سگریٹ پیتا رہا۔ میری یہ جسارت آغا سلطان کی افسرانہ شان کے خلاف تھی۔ چنانچہ دفتر میں داخل ہوتے ہی میری ”تواضع“ شروع ہو گئی اور میرے پاس جتنے بھی سگریٹ تھے، ضبط کر لئے گئے۔

ایس۔ پی آغا سلطان کے حکم پر کمرہ استقبالیہ میں مجھے ایک 10،9 انچ چوڑے لکڑی کے بنچ پر بٹھایا گیا۔ رات کے کوئی 11،10 بجے مسٹر اطہر ڈی۔ آئی۔ جی اور ایس۔ پی آغا سلطان ماتحت عملے کے کئی افراد کے ہمراہ میرے پاس آئے۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد میں نے ان سے کہا کہ اگر حکومت حقائق کی تلاش میں تھی تو پھر نور العارفین کمیشن کی رپورٹ میں اخذ کئے گئے نتائج غلط اور بے بنیاد تھے۔ صرف شیخ صاحب کے خط کو ان کے مخصوص حالات کو نظر انداز کرتے ہوئے رپورٹ کی بنیاد بنانا اور تحقیقات کے وقت ماسوائے چند افراد کے باقی تمام افراد کو نظر انداز کرنا سراسر نا انصافی تھی جیسا کہ اس وقت عام طور پر تاثر تھا کہ نور العارفین کمیشن رپورٹ مشرقی پاکستان میں مخصوص حالات کے زیر اثر بیجی حکومت کے کہنے پر تیار کی گئی تھی۔ میں نے مسٹر اطہر ڈی۔ آئی۔ جی سے کہا کہ اگر بین الاقوامی تقاضوں کے تحت پاکستان کے مفاد کی خاطر بھارت کو بدنام کرنا اور شیخ مجیب الرحمن کی گرفتاری کے لئے جواز پیدا کرنا ہی مقصود تھا تو اس معاملہ کو اس طرح حل کیا جانا چاہیے تھا کہ کشمیر کے موءف کو اور کشمیر میں پاکستان کے مفادات کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس سلسلہ میں میں نے اپنی اور اپنی جماعت کی طرف سے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ لیکن بجائے اس کے کہ یہ کوتاہ اندیش و بے ضمیر پولیس افسران میری باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے اطہر ڈی۔ آئی۔ جی چند رکیک گالیاں بگ کروہاں سے چلا گیا۔ اور یہاں سے مجھ پر ظلم و ستم کی ابتداء ہو گئی۔ مجھے مستظلاً ایک سب انسپکٹر یا اسٹنٹ سب انسپکٹر، ایک حوالدار، ایک سپاہی، ایک مسلح گارڈ کی حراست میں قید تنہائی میں رکھا گیا۔ ہر چار گھنٹہ کے بعد عملہ بدل دیا جاتا۔ ہر نیا عملہ آکر مجھ سے

بیان لکھواتا اور اس طرح مجھے جگائے رکھا جاتا۔

میری گرفتاری کے دوسرے دن مجھے کمرہ استقبالیہ سے ایک دوسرے کمرے میں جو کہ ایک زمانہ میں صدر تھا نہ کا حوالات ہوتا تھا، منتقل کیا گیا۔ شام کو مجھے ایس۔ پی آغا سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس نے مجھے مارشل لاء ریگولیشن 78 کے تحت نظر بندی کا حکم دکھایا۔ پہلے دس بارہ روز گھر سے کھانا اور تھوڑا بہت بستر منگوانے کی اجازت دی گئی تھی۔ لیکن بعد میں یہ رعایت ختم کر دی گئی۔ حتیٰ کہ میں نے جو قالین کی جائے نماز گھر سے منگائی تھی، وہ بھی پولیس افسران کے حکم پر واپس بھیجی پڑی۔ آٹھ روز مسلسل جگائے رکھنے کے بعد جب مجھے پہلی بار تھوڑی دیر سونے کی اجازت ملی تو لکڑی کا بیچ یا سینٹ کا فرش میرا بچھونا تھا۔

ایک دفعہ ایس۔ پی آغا سلطان، ڈی۔ ایس۔ پی وحید کے ساتھ میرے کمرے میں آیا اور پوچھ گچھ کرتا رہا۔ جب میں نے اس کو بتایا کہ میں نے چیف سیکرٹری پنجاب افضل آغا سے کہا تھا کہ اگر آپ جہاز واپس بھیجنا چاہتے ہیں تو مقبول احمد بٹ سے کہہ دیں وہ اخباری بیان جاری کریں گے۔ آغا سلطان نے یہ بات سنی تو بولے کہ وحید صاحب کو جو بیان تم نے دیا ہے اس میں یہ بات کیوں نہ لکھی۔ میں نے جواب دیا کہ میں نے ڈی۔ ایس۔ پی وحید سے اس واقعہ کا ذکر کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ بڑے افسر کا نام بیچ میں گھسیٹنے کی ضرورت نہیں ہے اور ویسے بھی یہ غیر متعلقہ بات ہے۔ آغا سلطان نے یہ کہہ کر یہ واقعہ بالکل متعلقہ ہے مجھے حکم دیا کہ میں خود اپنے ہاتھ سے مکمل بیان لکھوں۔ ان ایام میں مجھے پھر مسلسل جگایا جا رہا تھا۔ میں نے آغا سلطان سے کہا کہ تھوڑی بہت نیند کئے بغیر میرے لئے بیان لکھنا ممکن نہ ہوگا۔ اس لئے تھوڑا بہت آرام کرنے کی اجازت دے دی جائے لیکن اس نے انکار کیا اور حکم دیا کہ بیان مکمل ہونے تک مجھے بالکل نہ سونے دیا جائے۔ چنانچہ میں نے اس حالت میں تقریباً 90 صفحوں کا ایک بیان تین دن میں لکھ دیا۔ اس بیان میں کیا ترتیب ہے مجھے اب یاد نہیں۔



ایک روز مجھے سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں بلایا گیا جہاں مسٹر اطہر ڈی۔ آئی۔ جی موجود تھے۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی اطہر نے گالیاں دینا شروع کیں اور کہنے لگا کہ مقبول بٹ اور ڈاکٹر فاروق نے اعتراف گناہ کر لیا ہے اور تم کو بھی پھنسا یا ہے۔ اب ہمیں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ میں نے کہا اگر انہوں نے مجھ پر کوئی الزام لگایا ہے تو ان کو میرے سامنے لایا جائے۔ اس پر مسٹر اطہر آگ بگولا ہو گیا اور گالیوں کی بوچھاڑ میں کہا ”ان کو یہاں کیوں لائیں گے تم کو ہی وہاں لے جائیں گے“۔ اس کے بعد اُس نے کھڑکیاں اور دروازے بند کروائے اور مجھے ایس۔ پی آغا سلطان اور ڈی۔ ایس۔ پی وحید، شوکت، عبدالحق اور وصی کے سامنے مرغا بنوایا اور سپاہی کو مجھے مارنے کا حکم دیا۔ میری کمر پر ایک بہت بڑا سینٹ کا بلاک رکھا گیا اور پھر چھتر نامی ایک چڑے کی چیز سے مارا گیا۔ اطہر نے بذات خود مجھے لائیں ماریں اور گھونے مارے جس دوران مجھے مارا جا رہا تھا میں ”یا رسول اللہ انظر حالنا یا حبیب اللہ اسمع قالنا“، پکارتا جا رہا تھا۔ غالباً میرے خدا نے میری فریاد سن لی کہ نزدیک کی مسجد سے جمعہ کی اذان ہو گئی اور مجھے اس عذاب سے نجات مل گئی۔

متذکرہ تشدد کے دوران مسٹر اطہر نے مجھ سے پوچھا کہ میں کب سے قادیانی ہو گیا تھا۔ جس کا جواب میں نے دیا کہ میں قادیانی مذہب سے کیسے تعلق رکھ سکتا ہوں جب کہ میں نے اہل صفا کے ہاتھ پر بیت کی تھی۔ اس پر اُس نے میرے مرشد کے نام گالیاں دیں۔ کیونکہ اس کی نظر میں میرا مرشد کشمیری ہونے کی بناء پر غدار اور فاسق تھا۔ مسٹر اطہر نے مجھے بتایا کہ میرے خواجہ غلام نبی گلکار کے ساتھ تعلقات کے بنا پر وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ میں قادیانی تھا۔ اس کا جواب میں نے دیا کہ خواجہ غلام نبی گلکار تو آزادی کشمیر کی تحریک کے ان اوّلین بانیوں میں سے ہیں جنہوں نے شیر کشمیر اور چوہدری غلام عباس کے ساتھ مل کر تحریک آزادی شروع کی تھی۔ اس شخص کی دیانت اور حب الوطنی کا اعتراف اس کے سیاسی مخالفین کو بھی ہے۔ ان کو کشمیر کی سیاسی تحریک کی تاریخ میں ایک

خاص مقام حاصل ہے۔ اس کے علاوہ وہ آزاد کشمیر کے پہلے صدر تھے جنہوں نے مہاراجہ کشمیر کے خلاف بغاوت کر کے ایک متوازی حکومت کی بنیاد ڈالی تھی اور صدر انور کے نام سے مشہور تھے۔ میں نے مسٹر اطہر سے مزید کہا کہ ہمارے سیاسی تعلقات کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہمارے دینی عقائد پر اثر انداز ہوں بلکہ سیاسی طور پر وہ خود مختار کشمیر کے علمبردار تھے۔ لیکن محاذ میں شامل ہو کر ہم نے ان پر خود مختار کشمیر کے لئے تبلیغ کرنے پر پابندی لگا دی تھی جو انہوں نے قبول کر لی تھی۔ اس پر مسٹر اطہر نے بتایا کہ ”اُس کو گرفتار کر کے تشدد کر کے ہلاک کر دیا گیا ہے تاکہ خود مختار کشمیر کے جراثیم ہی پاکستان سے ختم کئے جائیں۔“ مسٹر اطہر نے کہا کہ کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ مارشل لاء لگا ہوا ہے اور جو بھی حکومت چاہے کر سکتی ہے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جناب گلکار سے متعلق اطہر کی کہانی جھوٹی تھی وہ اب بھی خدا کے فضل و کرم سے راولپنڈی میں اپنی زندگی کے دن گزار رہے ہیں (غلام نبی گلکار 1973ء کو فوت ہوئے)۔ میں نے مسٹر اطہر کو یہ بھی کہا کہ اگر محاذ رائے شماری میں گلکار صاحب کی شمولیت کے معنی محاذ کا قادیانی جماعت بننے کے مترادف ہے تو پھر اس وقت پاکستان پر حکومت بھی تو قادیانی کی ہے کیونکہ ایم۔ ایم۔ احمد، جنرل یحییٰ خاں کی حکومت کے ایک اہم ستون تھے۔ ان الفاظ سے اطہر آگ بگولا ہو گئے اور مجھ پر لاتوں، مکوں اور گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

جب مجھے اذان ہونے پر اُپر اٹھنے کی اجازت مل گئی تو میں نے دیکھا کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ وصی مجھ سے زیادہ پسینہ میں شرابور تھا۔ ایسے جیسے کہ وہ کپڑوں سمیت پانی میں غوطہ لگا کر آ گیا تھا۔ میرا بیان قلمبند کرنے کے بعد مسٹر وصی سے اسلام تصوف اور حج بیت اللہ پر کچھ گفتگو بھی ہوئی تھی۔ اس کو میں نے اسلام سے محبت رکھنے والا مسلمان اور عاشق رسول پایا۔ وہ میرے ساتھ باتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے مجھے سورۃ یوسف کی آیت کریمہ ”وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَاْفُ عَلٰی مَا تَصْنَعُوْنَ“ کا ورد کرنے کو کہا۔ تشدد کے بعد مسٹر اطہر نے میرے دونوں ہاتھوں میں جھکڑی لگانے کا حکم دیا۔ جب مجھے اپنے کمرہ میں لے گئے۔ تشدد کی اذیت کی وجہ سے میرا سارا



جسم کانپ رہا تھا۔ میں مشکل سے قدم اٹھا سکتا تھا۔

اس کے بعد میں کئی دن تک اچھی طرح سے نماز ادا نہ کر سکا۔ چھتروں کی مار کی وجہ سے میرے اعصاب متاثر ہو گئے تھے۔ میں رکوع میں جا ہی نہیں سکتا تھا اور سجدے کے لئے آہستہ اترنے کی بجائے مجھے جسم کو گرانا پڑتا تھا۔ میں فرش پر درد کی وجہ سے اچھی طرح بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے ہر چند منٹوں کے بعد پہلو بدلنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی باندھ کر رکھی گئی تھی۔ صرف وضو اور نماز کے لئے ایک ہاتھ کی ہتھکڑی کھول دی جاتی اور ہتھکڑی میرے ایک ہاتھ سے نماز کے دوران لٹکتی رہتی۔

مجھے کئی بار ایس۔ پی اور ڈی۔ ایس۔ پی نے دفتر میں تفتیش کے لئے بلایا۔ مجھے تفتیش کے موقعوں پر یہ دیکھ کر صدمہ ہوا کہ اس بد قسمت ملک کے سیاہ سفید کے مالک یہ افسران ملک کی سیاست سے عموماً اور پاکستان کے کشمیر سے متعلق موء قف سے بالخصوص نا بلند تھے۔ ان کو اقوام متحدہ کے سامنے کشمیر سے متعلق پاکستان کے موء قف کا بھی بالکل علم نہیں تھا۔ وہ مجھ سے آزاد کشمیر کے متعلق اس طرح باتیں کرتے تھے جیسے آزاد کشمیر پاکستان کا کوئی مفتوحہ علاقہ ہو۔

مسٹر وحید ڈی۔ ایس۔ پی نے ایک دفعہ مجھ سے پوچھا کہ سیاست میں میرا آئیڈیل کون ہے۔ وہ غالباً سمجھتا تھا کہ میں قائد اعظمؒ یا شیخ محمد عبداللہ کا نام لوں گا۔ لیکن وہ چونک گیا جب میں نے اس کو کہا کہ اس مسئلہ پر میں نے آج تک سوچا ہی نہیں البتہ میں نے مولانا حسرت موہانی کو ہمیشہ بہت پسند کیا، لاشعوری طور پر وہی آئیڈیل ہے۔ اس پر وحید صاحب کا ردِ عمل عجیب تھا۔ فرمانے لگے کہ اب میں سمجھ گیا کہ تم اشتراکی بھی ہو اور تخریب پسند بھی، ساتھ میں چند غلیظ گالیاں بھی عنایت فرمائیں۔ مسٹر وحید جب مجھے آغا سلطان کی غیر موجودگی میں بلاتا تھا تو متعلقہ تفتیش کے علاوہ وہ سیاست پر بات چیت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ میں نے اس کی غیر منطقی اور مہمل بحث سے تنگ آ کر اس کو ایک دفعہ کہہ دیا کہ بہتر ہے کہ ہم سیاست پر بات نہ کریں، پھر کیا تھا وحید صاحب نے

اس کو اپنی تحقیر سمجھا اور مجھے گالیاں دینے لگے اور مجھ پر متعین سب انپکٹر کو یہ حکم دیا کہ میری ”خبر لی جائے“ یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔ ایک چیز جو میرے لئے زیادہ مصیبت بنی ہوئی تھی وہ میری فارغ البالی تھی۔ اس کا ذکر ڈی۔ ایس۔ پی وحید، ایس۔ پی قمر عالم اور مسٹر اطہر نے بھی تشدد کرتے وقت بار بار کیا۔ میں نے مسٹر اطہر کو ایک دفعہ جگ آ کر یہ بھی کہا تھا کہ اگر حکومت کو میری خوشحالی پسند نہیں ہے تو میں آج سارا اثاثہ حکومت کے نام لکھنے کو تیار ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں پھر اپنے دست و بازو سے دولت پیدا کر سکتا ہوں، کیونکہ میں محنت و مشقت کرنا اور حلال کی دولت پیدا کرنا جانتا ہوں۔ قلعہ میں اسیری کے دوران مجھے کئی بار یہ کہہ کر ڈرانے کی کوشش کی گئی کہ حکومت میری اور میر قیوم کی جائیداد اور کاروبار کو ضبط کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ لیکن ان کو زمغزوں کو علم نہ تھا کہ اگر میں نے دولت کو اپنی منزل سمجھا ہوتا تو دوسرے سرمایہ داروں کی طرح قوم کی آزادی کے لئے جدوجہد کے پُر خادشت میں کبھی قدم نہ رکھتا اور موجودہ دولت سے چار چھ گنا زیادہ سرمایہ کا مالک ہوتا۔

کراچی سی۔ آئی۔ اے میں جو برتاؤ اور تشدد میرے ساتھ کیا گیا اس وقت مجھے وہ بہت زیادہ اور غیر انسانی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن قلعہ میں آ کر میں نے محسوس کیا کہ وہاں تفتیش کنندگان قلعہ کے بے رحم، سنگدل اور خون کے پیاسے بھیڑیوں کے مقابلہ میں فرشتہ خصلت لوگ ہیں۔

کراچی میں سی۔ آئی۔ اے پولیس دفتر میں گرفتاری کے دوران 15-20 دن کے بعد نہانے کی اجازت دی جاتی۔ دو دو ہفتے داڑھی بڑھ جاتی۔ صرف نہاتے وقت کپڑے بدلنے کی اجازت دی جاتی جس سے ہمارے بدن اور کپڑوں میں بوجہ گرمی اور پسینہ بدبو پیدا ہو گئی تھی۔

16 یا 17 جون کی صبح کو ایک اسٹنٹ سب انپکٹر، ایک حوالدار اور تین مسلح سپاہیوں کی معیت میں مجھے پاکستان ایکسپریس کے تیسرے درجے کے ذریعہ لاہور لایا گیا۔ مجھے ریلوے اسٹاف کے ڈبے میں بٹھایا دیا گیا اور میری ہتھکڑی جو میرے دونوں ہاتھوں میں پہنائی ہوئی تھی، کو بچ کے ساتھ باندھا گیا۔ کھڑکیاں اور دروازے بند کر دیئے گئے۔ جس وقت مجھے کراچی سے نکالا



گیا میری تلاشی لی گئی۔ میری جیب میں ایک روپیہ پڑا ہوا تھا وہ بھی مجھ سے چھین لیا گیا۔ کراچی سے لاہور تک مجھے بغیر آب و دانہ کے بھوکا پیاسا لایا گیا۔ میں نے ٹرین میں بیت الخلاء میں وضو کرنے کے دوران پانی پی پی کر پیاس بجھائی۔

کراچی سے چلنے کی دوسری صبح مجھے لاہور کے شاہی قلعہ میں پہنچایا گیا۔ قلعہ میں آتے وقت میرے ساتھ آئے ہوئے اے۔ ایس۔ آئی کے ہاتھ میں میں نے ایک بند لفافہ دیکھا تھا۔ جو ایس۔ پی قمر عالم کے نام تھا۔ اس طرح سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے قمر عالم کی سپردگی میں دیا گیا ہے۔ قلعہ میں پہنچتے ہی میرے ساتھ تفحیک آمیز سلوک کیا گیا۔ میرے سر سے ٹوپی اتار کر نیچے پھینک دی گئی اور مجھے کھڑا رکھا گیا۔ میری تلاشی لے کر مجھ سے میرا مختصر سامان لے لیا گیا۔ صرف مجھے ایک تولیہ اور پلاسٹک کا ایک لوٹا ساتھ رکھنے کی اجازت دی گئی اور مجھے نمبر 5 سیل میں بند کر دیا گیا۔

تقریباً 12 بجے مجھے سیل سے نکال کر سپرنٹنڈنٹ پولیس قمر عالم کے سامنے پیش کیا گیا۔ قمر عالم نے مجھے کھڑا رکھ کر سوالات شروع کئے۔ میرے بیان کے دوران سچ سچ میں قمر عالم گندی گالیاں دیتا رہا اور تفحیک آمیز فقرے کہتا رہا اور سچ سچ میں مجھ پر تھوکتا رہا۔ اس دوران ایک دفعہ محمد خان نامی سپاہی دفتر میں آیا تو قمر عالم نے اسے کہا کیسے آئے ہو۔ اس نے پیپروں کی ضرورت کا اظہار کیا تو قمر عالم نے اس کی طرف ہن کش بڑھاتے ہوئے کہا کہ لے جاؤ۔ مجھے صرف ایک ہن کی ضرورت ہے۔ اُس نے ایک ہن اس ہن کش سے نکال کر ہاتھ میں رکھ لی اور مجھے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد چھوٹا رہا۔ میرے بیان کے دوران جب میں اپنے والد کے انتقال کے واقعہ پر پہنچا تو قمر عالم نے ”خس کم جہان پاک“ کا فقرہ چست کیا۔ دو گھنٹے کے سوال و جواب کے بعد قمر عالم نے مجھے حکم دیا کہ میں سیل میں واپس جا کر بیان تحریر کروں اور چھ بجے تک مکمل کر لوں۔ ساتھ ہی اس قلعہ کے عمل کو حکم دیا کہ چھ بجے مجھ پر اوپریشن نمبر 3 کا عمل کیا جائے۔

سیل میں بند ہونے کے تھوڑی دیر بعد مجھے کاغذ قلم دیا گیا چونکہ آتے وقت مجھ سے میرا

چشمہ چھین لیا گیا تھا۔ اس لئے میں جلد ہی بیان لکھنا شروع نہ کر سکا۔ میں نے چشمہ مانگا جو کہ میرے کپڑوں کے ساتھ کہیں بند رکھا گیا تھا۔ تین بجے سے لے کر 6 بجے تک میں بیان لکھتا رہا۔ لیکن کمزوری، نقاہت اور گرمی کی وجہ سے بیان مکمل نہ کر سکا۔ پورے چھ بجے لائن ایفیر تاج دو تین اور سپاہیوں کے ساتھ آیا اور مجھ سے بیان مانگا۔ میں نے کہا کہ ایک تو آپ نے مجھے چشمہ تین بجے دیا تھا اس لئے مجھے ایک گھنٹہ کی مہلت ملنی چاہیے۔ دوم میرا بیان اتنا لمبا ہے کہ میں اس کو اتنی جلدی ختم نہیں کر سکتا۔ اس نے کہا ہم کو جتنے وقت کی اجازت ہے۔ اتنے وقت سے زیادہ ہم نہیں دے سکتے۔ چنانچہ مجھ سے نامکمل بیان لیا گیا اور مجھے سیل کے دروازے کے پاس بلایا گیا۔ مجھے حکم دیا گیا کہ میں اپنی پیٹھ باہر کی طرف اور منہ اندر کی طرف کر لوں۔ اس کے بعد مجھ سے بازو اوپر کر کر مجھے جھکڑی اور اس کی زنجیر سے دروازہ کے ساتھ اس طرح جکڑ دیا گیا کہ میرے پاؤں کے پنجے زمین پر ٹکتے تھے اور ایڑیاں اوپر رہتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ڈھائی تین فٹ ہانس کا ڈنڈا (جس پر سائیکل کا ٹیوب چڑھایا گیا تھا) میری گردن کے پیچھے دیا گیا اور مجھے ایک دو تین چار کی گنتی کا حکم دیا گیا۔ مسلح سپاہی جو گارڈ پر وہاں کھڑا تھا۔ اس کو حکم دیا گیا کہ مجھ سے گنتی کرائے اور مجھے سونے نہ دے۔ میں نے گنتی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بدلے نام الہی اور نام رسول لیتا رہا۔ گرمی سے میں پسینہ سے شرابور تھا۔ ہر دو تین منٹ کے بعد مجھے پیاس لگتی تھی اور میں نیم بے ہوشی کے عالم میں پانی پانی چلاتا۔ جو سپاہی ڈیوٹی پر تھا وہ آکر ایک گندے ٹین کے گلاس میں پانی لا کر میرے منہ کے ساتھ لگاتا جو کچھ تو میں پیتا تھا اور زیادہ حصہ میرے کپڑوں پر گر جاتا تھا۔ میری گردن میں کسے ہوئے ڈنڈے کا عذاب اتنا شدید تھا کہ نام خدا لینے کے ساتھ میں کراہ بھی رہا تھا۔ اپنی گردن کو کچھ آرام دینے کے لئے جب گردن ہلاتا تو وہ ڈنڈا کبھی کبھی باہر نکل کر نیچے گر پڑتا۔ ڈیوٹی پر متعین سپاہی آکر ڈنڈا پھر میری گردن میں گستا اور کہتا کہ کیوں میری شامت لاتے ہو۔ اگر اب ڈنڈا گراؤ گے تو میں افسروں کو بلاؤں گا پھر تمہاری خیر نہیں۔ بہر حال مجھے احساس ہوا کہ اس سپاہی کے سینے میں دل



ہے۔ اس لئے اس نے کسی افسر سے شکایت نہ کی اور مجھے پانی پلاتا رہا۔ تین گھنٹے اس طرح ڈنڈا میری گردن اور کھڑے بازوؤں کے درمیان رکھنے کے بعد 9 بجے ڈی۔ ایس۔ پی مختار اور درندہ صفت لائن افسر تاج آیا۔ اس وقت میں پورے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ لیکن یہ ورد کر رہا تھا ”یا رسول اللہ انظر حالنا یا حبیب اللہ اسمع قالنا“۔ آتے ہی لائن افسر نے ڈیوٹی پر متعین پولیس والے کو ڈانٹا اور مجھے گالیاں دیں کہ میں کتنی کیوں نہیں کر رہا۔ ڈی۔ ایس۔ پی مختار نے مجھ سے پوچھا یہ کیا کشمیری میں گا رہے ہو یا ہم کو گالیاں دے رہے ہو۔ میں نے نجیف آواز میں جواب دیا کہ یہ ورد خواجہ معین الدین چشتی ”داتا دربار کے قیام کے دوران کرتے رہے ہیں۔ اس کے بعد ڈی۔ ایس۔ پی مختار نے میری گردن میں اٹکایا ہوا ڈنڈا نکال دیا اور میری گردن ایک طرف لٹک گئی۔ اس پر اس نے وزنی گالی دیتے ہوئے کہا کہ ”ادارکاری کرتے ہو“ اس طرح تین گھنٹے کی اس اذیت سے مجھے تھوڑا سا آرام ملا لیکن مجھے ہتھکڑی سے دروازے کے ساتھ جکڑ کر رات بھر لٹکائے رکھا۔ جب 9 بجے میری گردن سے ڈنڈا نکالنے کے لئے ڈی۔ ایس۔ پی مختار آیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ کم از کم مجھے نماز کے لئے کھول دیا جائے۔ جس پر اس نے کہا اسلام میں بحالت مجبوری اشاروں سے بھی نماز ہو سکتی ہے بلکہ ساتھ ہی کہا کہ اگر پیشاب آئے تو اسی طرح لٹکتی حالت میں کپڑوں میں ہی کرنا۔ دوسرے دن صبح سات بجے مجھے جب کھولا گیا تو میں نیچے گر پڑا۔ میرے بازو شل ہو چکے تھے اور میں اپنی ٹانگوں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے حکم دیا گیا میں ایک گھنٹہ سستالوں کیونکہ مجھے 8 بجے ایس۔ پی کے سامنے پیش ہونا ہے۔ ایک ٹین کے میلے گلاس میں جس میں ایک طرف سوراخ تھا۔ مجھے ایک پیالی چائے کے نام سے مشروب اور ایک رس دیا گیا۔ کراچی سے چلنے کے بعد مجھے یہ پہلی دفعہ کھانے کو مل رہا تھا۔

8 بجے صبح مجھے ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ جو تشدد کے لئے مخصوص رکھا گیا ہے۔

یہاں پر ایس۔ پی قمر عالم موجود تھا۔ اس نے قلعہ کے ظالم انچارج درانی کو حکم دیا کہ ”میرے

گوریوں کو بلاؤ۔‘ چنانچہ دس بارہ آدمی لائے گئے۔ جنہوں نے آتے ساتھ ہی میرے کپڑے زبردستی اتارے اور مجھے مادرزاد ننگا کر دیا۔ اس زبردستی کپڑے اتارنے کے عمل میں میرا کرتہ بھی پھٹ گیا۔ قمر عالم نے مجھے اپنے سامنے ننگا رہنے کا حکم دیا اور خود میرا رات کا لکھا ہوا بیان پڑھنے لگا۔ ایک آدھ سطر پڑھنے کے بعد ڈی۔ ایس۔ پی مختار کو دیا اور اس کو پڑھنے کے لئے کہا۔ وہ پڑھتا جاتا تھا اور قمر عالم موٹی موٹی گالیوں سے بھرپور ساتھ ساتھ رنگ کمیٹری کرتا جاتا تھا۔ اور میرے بدن پر تھوکتا بھی جاتا تھا۔ بیان سننے کے بعد قمر عالم نے کہا کہ یہ داستان ہم پہلے بھی سُن چکے ہیں ہمیں کوئی نئی بات سُنی ہے۔ اس لئے یہ بیان اس کے مُنہ میں ٹھونس دو۔ چنانچہ اس نے وہ بیان ڈی۔ ایس۔ پی مختار سے چھین کر میری طرف پھینک دیا اور مجھے حکم دیا کہ میں اس بیان کو کھا جاؤں۔ جب میں نے کچھ ہچکچاہٹ سے کام لیا تو سپاہیوں نے میرا منہ کھول دیا اور کاغذ میرے منہ میں ٹھونس لگے جو مجھے چبانے پڑے۔ اس کے بعد وہاں موجود سپاہیوں کو (جن کو قمر عالم گوریا کے نام سے پکارتا تھا) حکم دیا کہ مجھ پر آپریشن کیا جائے۔ چنانچہ دس بارہ سپاہی بیک وقت مجھ پر پل پڑے۔ کسی کے ہاتھ میں ٹیبل ٹینس کھیلنے والی ریکٹ کی شکل میں چمڑے کی بنی ہوئی چیز تھی۔ جس کو وہ جھتر کہتے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں ناز کا ایک لمبا ٹکڑا تھا۔ کسی کے ہاتھ میں سائیکل ٹیوب کا ربڑ چڑھا ہوا ڈنڈا تھا۔ جس کے ہاتھ خالی تھے وہ میرے سر کے بال نوچتے یا سینے کے بال توڑنے میں لذت محسوس کر رہا تھا۔ اس تشدد کے بعد مجھے چار پائی کے ساتھ اس طرح باندھا گیا کہ میری ٹانگیں کھول کر چار پائی کی پٹیوں سے نیچے لٹکائیں اور نیچے سے میرے پیروں کو میرے کرتے سے باندھا گیا۔ چار پائی پر مجھے ڈنڈے کے سہارے بٹھایا گیا اور مجھے پیچھے لیٹنے کو کہا گیا۔ میرے نیچے سے ڈنڈا نکالا گیا اور چار پائی کی رسیوں کو آہستہ آہستہ ڈھیلا کیا گیا اور میرے بازوؤں کو پیچھے لے جا کر میرے ہاتھوں کو باندھا گیا۔ یہ اتنا اذیت ناک عمل تھا کہ میں چیخ اٹھا۔ ساتھ ہی ساتھ موم بتی سلگائی گی اور اس کو جلا کر موم بتی کے پگھلتے قطرے میرے جسم کے نازک حصوں پر پٹکائے گئے۔



اس کے ساتھ ہی بجلی کا ایک آلا لایا گیا جس پر ایک ہینڈل لگا تھا۔ یہ ہینڈل گھمانے سے بجلی پیدا ہوتی تھی اور اس کے تار کو میرے عضو تناسل، میرے منہ، میری چھاتی اور میرے کانوں میں جوڑ کر جھٹکے دیئے گئے۔ اس طرح کا تشدد برابر بارہ بجے تک جاری رہا۔ بارہ بجے مجھے نیم مردہ حالت میں دو آدمیوں نے سہارا دے کر سیل میں لے جا کر پھینک دیا۔

رات کو آٹھ بجے مجھے پھر تشدد کرنے والے کمرے میں لے گئے اور پھر قمر عالم کے گوریلوں کو بلایا گیا۔ اور مجھ پر دوبارہ وہی صبح والا تشدد دہرایا گیا۔ اس وقت صرف یہ فرق کیا گیا کہ وہی محمد خان نامی شخص پہلے قمر عالم سے میری ظاہر اسفارش کرتا رہا کہ جناب ابھی بتائے گا۔ اس کو تھوڑی سی مہلت دیجئے۔ اس کے بعد مجھ سے کہتا رہا بتاؤ جو کچھ ”صاحب“ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ جب میں نے اس سے کہا کہ میں نے حقیقت کا اظہار کیا ہے تو پھر مجھے دوبارہ چار پائی پر باندھا گیا اور اس دفعہ محمد خان میرے سینے پر چڑھ کر اپنا عضو تناسل میرے منہ کے پاس لے آیا اور کہنے لگا کہ میں منہ میں پیشاب کر دوں گا۔ مجھے چار پائی پر باندھے ہوئے بھی مارا جاتا تھا۔ جب میں بے ہوش ہو جاتا تو مجھے کھول دیا جاتا۔ ہوش آنے پر پھر باندھ دیا جاتا۔ گرمی اور تشدد کے مارے مجھے زبردست پیاس لگتی۔ پانی پینے کے لئے التجا کرتا تو پانی کا گلاس سامنے طاقے پر رکھا جاتا اور مجھے کہا جاتا کہ اس کو اٹھا کر پیو۔ جب میں گلاس کی طرف بڑھتا تو سامنے سے ایک سپاہی آ کر مجھے چھتر سے مارتا۔ میں دوسری طرف ہٹتا تو دوسرا سپاہی اس طرف سے مجھے مارتا۔ فٹ بال کی طرح مجھے ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کی طرف باری باری مارتے ہوئے دھکیل دیا جاتا اور زد و کوب کیا جاتا۔ میں مادر زاد برہنگی کے عالم میں خدا کے حضور التجا کرتا۔ رب انسی مغلوب فانتصر۔ میری التجا پر قمر عالم نے مجھ سے پوچھا یہ کشمیری میں کیا گارہے ہو۔ میری زبان سے جب ”یا رسول اللہ“ کی آواز نکلتی تو مجھے یہ مسلمان نمازی دی پولیس والے کہتے کہ میں نگلی حالت میں رسول اللہ کا نام لے کر توہین کر رہا ہوں اور مجھے اور بھی زور زور سے مارنے لگتے۔

ایک موقعہ پر قمر عالم جو اس وقت قمیض شلوار میں ملبوس تھا، انسپکٹر درانی کو یہ حکم کر گیا کہ میں عشاء کی نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔ میں نماز پڑھتے ہوئے اس کی چیخیں سننا چاہتا ہوں۔ چنانچہ جب تک قمر عالم واپس نہیں آیا مجھ پر تشدد کیا جاتا رہا اور وہ میری چیخوں سے اپنی نماز (اگر اس نماز کہیں تو) کو بہلاتا رہا۔ یہی وہ موقع تھا کہ مجھے یقین آیا کہ کربلا میں آل محمد کو پیاس سے نڈھال کر کے شہید کرنے والے بھی مسلمان ناموں سے موسوم تھے۔ ایک موقعہ پر بجلی بند ہو گئی تو مجھے قمر عالم نے کہا ”بھاگ جاؤ بھاگ جاؤ اور سپاہی کو کہا کہ اس کو پیچھے سے گولی مار دو“ میں برہنہ تھا میں کیسے بھاگ سکتا تھا اگر برہنہ نہ بھی ہوتا تو قلعہ کی بلند دیواروں اور خونخوار محافظوں کو چھوڑ کر میں اپنے اوپر درجن بھر تشدد کرنے والے درندوں سے کیسے بچ کر نکل سکتا تھا اور مجھے یہ بھی اگر یقین ہوتا کہ یہ مجھے گولی مار دیں گے تو اس وقت میں موت کو ترجیح دیتا۔ لیکن مجھے قمر عالم کی عیاری اور مکاری سے معلوم ہو رہا تھا کہ اس کا مقصد مجھے گولی مار کر ہلاک کرنا نہیں بلکہ اپنا کوئی مذموم مقصد پورا کرنا ہے۔ پھر بھی میں نے کہہ دیا کہ مجھے بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ گولی چلا دیں، آپ بعد میں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھاگنے کی کوشش میں مارا گیا۔ جب تھوڑی دیر کے بعد بجلی آگئی تو سپاہی کو کہنے لگا ”بیوقوف اگر تم نے اس بندوق سے گولی چلائی ہوتی تو ہم سب مارے جاتے۔ یہ تو 12 بور کی رائفل ہے۔ اس کو 3/3 سے گولی ماری تھی“۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ یہ سب ڈرامہ تھا یا حقیقت کیونکہ میں نے رائفل والے کو نہیں دیکھا۔ وہ باہر دروازے کے پاس اندھیرے میں کھڑا تھا۔ اس شام تشدد کے دوران ایک نوجوان کو جو کہ کربلا شلوار میں ملبوس تھا۔ انسپکٹر درانی نے لا کر کرسی پر بٹھایا اور میری حالت زار دکھا کر اسے حامد کے نام سے پکار کر حقیقت ظاہر کرنے کے لئے کہا گیا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ اس نے کہا ”میرے پاس خط و کتابت موجود ہے وہ آپ دیکھ لیں“۔

اس شخص کے سامنے برہنہ حالت میں تشدد کرتے ہوئے درانی نے مجھ سے یہ انام، پتا کاروباری حالات، مغربی ممالک کے سفر، انکم ٹیکس وغیرہ کے متعلق سوالات کئے جس سے وہ متذکرہ



حامد صاحب کو دکھانا چاہتے تھے کہ قلعہ میں STATUS کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ کوئی صاحب وائریس رکھنے کے کسی کیس میں مہ اپنی بیوی کے پکڑے گئے تھے اور قلعہ میں محبوس تھے۔ کیپ جیل پہنچنے پر مجھے معلوم ہوا کہ حامد صاحب دراصل حامد محمود صاحب ہی تھے جن کا احمدی فرقہ کے سربراہ سے نزدیک کا رشتہ تھا۔ اس شام بھی آٹھ بجے سے لے کر رات بارہ بجے تک مجھ پر مختلف طریقہ سے تشدد دھوتا رہا۔ 12 بجے رات کو مجھے لے جا کر اس سیل کے دروازے کے ساتھ پہلے کی طرح باندھ کر لٹکایا گیا اور کنتی کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس رات فرق صرف اتنا تھا کہ میری گردن اور بازوؤں کے درمیان ڈنڈا نہیں لگایا گیا۔ ویسے دن میں دو دفعہ یہ ڈنڈے کا عمل بھی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کیا گیا تھا۔ اس رات بھی میں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پانی مانگتا رہا اور سپاہی گالیوں کے ساتھ میرے منہ سے ٹین کا گلاس لگا کر مجھے پانی پلاتا رہا جس میں سے ایک دو گھونٹ میرے منہ میں چلے جاتے اور باقی کپڑوں پر گر جاتا تھا۔

قلعہ میں پہنچنے کے تیسرے دن صبح پھر مجھے ایک گھنٹہ کھول کر رکھنے اور چائے پلانے کے بعد کمرہ تشدد میں لے جایا گیا اور حسب معمول مختلف طریقوں سے تشدد کیا گیا۔ جب میری ٹانگوں کو کھول کر اوپر سے لٹکایا جاتا اور نیچے دونوں پیروں کو باندھ کر گس دیا جاتا تو چار پائی پر کبل بچھا دیا جاتا۔ اُس روز کبل صحیح طریقے سے نہیں بچھی تھی جس کے نتیجے میں چار پائی کی رسیوں سے میری ٹانگیں چھل گئیں اور دوبارہ شام کو اس طرح کے تشدد سے ٹانگوں میں زخم ہو گیا۔ دوسرے دن جب لائن آفیسر تاج نامی اے۔ ایس۔ آئی نے میری ٹانگوں پر زخم دیکھے تو کہنے لگا کہ ”میں کسی کام سے گیا ہوا تھا ورنہ میں کبھی تمہاری ٹانگوں پر زخم ہونے نہ دیتا“۔ یہی وجہ ہے کہ راولپنڈی میں سماعت کے پہلے ہی دن میں نے جناب والا کو اپنے زخموں کے نشانات دکھائے تھے جو اب تک صرف نشانات کی صورت میں موجود ہیں بلکہ اس میں پینہ آنے کی صورت میں خارش بھی ہوتی ہے اور درد بھی ہوتا ہے۔

جناب والا! عموماً گواہوں سے تشدد کے بارے میں وکیل استغاثہ نے سوال کئے کہ آیا ان کے بدن پر کوئی زخم کا نشان ہے۔ میری ٹانگوں پر جو نشانات ہیں وہ صرف ذرا سی غفلت اور سہو کی وجہ سے لگ گئے ورنہ پولیس کا معاملہ میں کافی ماہر ہوتا ہے کہ تشدد دہی کرتے ہیں اور نشان بھی نہیں چھوڑتے۔ میرا بدن چھتروں، نائز کے ٹکڑوں اور سائیکل کی ٹیوب چڑھائے ہوئے ڈنڈوں سے داغدار ہو گیا تھا۔ دوسرے دن قلعہ میں پولیس ڈسپنری میں متعین ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ جس نے میرے بدن پر سپرٹ لگا کر بیرونی نشانات کو تو مٹا دیا۔ لیکن اس تشدد سے میرے اعصاب پر کیا اثر ہوا وہ اثر کتنے مہینوں تک رہا اس کی گواہی سکھر ڈسٹرکٹ جیل اور سکھر سنٹرل جیل کے ڈاکٹر صاحبان دیں گے جو میرا علاج کرتے رہے اور اب وہ صحیح طور پر ٹھیک نہیں ہوئے ہیں۔

مجھ پر تین روز تک روزانہ صبح شام یہ تشدد جاری رہا اور جب میری ٹانگ کا زخم زیادہ خراب ہو گیا تو ایک دو روز مجھے جسمانی تشدد تو نہیں کیا گیا البتہ ہتھکڑی باندھ کر رات کو لٹکانے کا عمل جاری رہا۔ لٹکانے اور ٹانگ میں زخم ہونے کی وجہ سے میری ایک ٹانگ سوجھ گئی اور میں شلوار اوپر نہ چڑھا سکا۔ چنانچہ میں نے ڈیوٹی پر متعین سپاہی سے بندوق کی انگین سے شلوار کا پاؤں نیچے کٹوا کر گھسلا کر ایسا تاکہ میں شلوار اوپر چڑھا سکوں اور زخم کو رگڑ سے بچا سکوں۔

زخموں کی وجہ سے مجھے دو روز تک جو جسمانی تشدد سے نجات ملی تو قمر عالم کو چین نہ آیا۔ چنانچہ مجھے ایک اور کمرے میں لے جایا گیا اور پہلے چھتروں اور ڈنڈوں سے تشدد کیا گیا۔ بجلی کے جھکے لگائے گئے اور موم بتی کے قطرے جائے ستر پر ڈالے گئے اس سے بھی جب پولیس کا جی نہ بھرا تو قمر عالم نے ملک شفیع ڈی۔ ایس۔ پی کو بلایا اور اس کو کہا گیا کہ وہ اپنے نمبر 7 آپریشن کا عمل مجھ پر کرے۔ چنانچہ مجھے اوندھے منہ لٹکایا گیا اور میرے پیروں کو چار پائی کے پیروں کی طرف کی پٹی سے باندھا گیا اور پھر اوپر اٹھا کر جسم کو چار پائی پر لٹایا گیا۔ میرے دونوں بازوؤں کو کھینچ کر باندھا گیا۔ میرے بازو کو اتنے زور سے کھینچا گیا کہ میری زبان سے چیخ نکلی کہ ہائے میرا بازو ٹوٹ



گیا۔ قمر عالم نے سپاہی سے کہا کہ بازو توڑنا نہیں ہے صرف تکلیف پہنچانا مقصود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے بائیں بازو میں اب تک شدت کا درد رہتا ہے۔ چنانچہ اس عدالت سے درخواست پر یہ بازو میں نے اسپیشلسٹ کو بھی دکھایا لیکن آج تک کوئی افاقہ نہ ہوا کیس کمپ جیل کے ڈاکٹر نے جب سب علاج کئے تو اس نے تنگ آکر کہا کہ اس کا اب ایک ہی علاج ہے کہ اس کا پلاسٹر کیا جائے اور اس کو دو تین ہفتہ آرام ملے۔ لیکن ہر روز عدالت میں حاضری کی وجہ سے میں پلاسٹر اکرانے سے معذور تھا۔ چنانچہ اس ڈاکٹر نے میرے اپنے خرچہ سے (INFRARED LAMP) منگوا کر مجھے اُن سرخ شعاعوں کی سینک پہنچانے کو کہا جو عمل روزانہ جاری ہے۔ میں معزز وکیل استغاثہ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا ان کو کبھی احساس ہوا کہ میرا یہ بازو ان کی پولیس کے تشدد سے تقریباً بے کار ہو چکا ہے اور میں نے درد کے مارے سردیوں میں کئی کئی راتیں جاگتے میں گزاری ہیں بلکہ کئی دفعہ عدالت میں بھی درد کے شدید دورے پڑے۔ آپ نے غالباً دیکھا ہوگا کہ سردیوں کے زمانے میں عدالت میں ہر وقت بازو پکڑے بیٹھا کرتا تھا۔

جناب والا! تشدد کے دوران ایک دفعہ تنگ آکر میں نے چارپائی سے اپنا سر کھراتے ہوئے رسول اللہ کے دربار میں درخواست کی کہ یا رسول اللہ جو حقیقت تھی اُس کا اظہار کر چکا ہوں اور اب آپ ہی میری رہنمائی فرمائیں کہ یہ مجھ سے کیا کھلوانا چاہتے ہیں۔ یہ سر کھرانا ایک معمولی ردِ عمل تھا۔ لیکن پولیس والے غالباً اس سے یہ سمجھے کہ میں اپنے آپ کو زخمی کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ تھپڑوں اور لالتوں سے میری مرمت کی گئی۔ ایک روز تشدد کے دوران مجھے قمر عالم ایس۔ پی نے پوچھا آیا میں SADIST کے معنی سے واقف ہوں۔ میں نے ہاں کی۔ پوچھا کیا ہوتا ہے میں نے جواب دیا ”موذی“ جو کسی کو تکلیف پہنچاتے ہوئے تسکین حاصل کرتا ہو۔ اس نے جواب دیا کہ میں SADIST ہوں۔ ”جب تک میں دن میں ایک دو دفعہ یہ تماشا نہ دیکھوں میرا کھانا ہضم نہیں ہوتا“۔ سبحان اللہ۔ پانچ وقت کا نمازی اور باپیر ہونے کا دعویٰ کرنے والے شخص کا یہ کردار۔ اسلام

کے نمونے اگر یہی ہیں تو بعید نہیں کو لوگ ایسے اسلام سے برگشتہ ہو جائیں۔ ایسے لوگ اسلام اور طریقت کے لئے ناسور ہیں۔ میں طریقت کا متوالا ہوں صرف اس لئے کہ طریقت میں مخلوق خدا سے پیار، محبت اور رحم سکھایا گیا ہے۔ اگر طریقت قمر عالم کی پیری مریدی ہے اور اس طرح کا ظلم و ستم تو پھر میں لامذہب کہلانا پسند کروں گا۔ ایسے مذہب کو میرا دور سے سلام۔

قمر عالم جب تک ہماری تفتیش کا انچارج رہا۔ اس وقت تک جسمانی اذیت کسی نہ کسی طریقہ سے جاری رہی۔ اس دوران ایک دفعہ جب مجھے اطہر کے سامنے پیش کیا گیا اور وہاں پر ملٹری کا ایک کرنل بھی موجود تھا تو انہوں نے مجھ سے بہت نرم لہجے میں باتیں کیں۔ گندھارا آرٹ کے نمونے جمع کرنا میری HOBBY ہے، اس پر بھی گفتگو ہوئی۔ میں نے گفتگو کے اختتام پر ڈرتے ڈرتے ان کو اپنی ٹانگیں دکھائیں۔ لیکن انہوں نے ایسے دیکھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اس وقت تک میرے کپڑے بہت میلے ہو چکے تھے۔ مجھے شلوار کے بدلے تہبند دی گئی تھی۔ کیونکہ میری دونوں ٹانگیں سو جھگنی تھیں اور زخم زیادہ ہرے ہو گئے تھے۔ میں نے دونوں افسروں کا رویہ جب نرم دیکھا تو جرات کر کے ان کو کہہ دیا کہ خدا کے لئے آپ جو سلوک ہم سے چاہیں کریں۔ لیکن ایسا کوئی قدم نہ اٹھائیں جس سے پاکستان کے موء قف اور کشمیر کی جنگ آزادی کو کوئی نقصان ہو۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میرے اس خیال کی پاداش میں مجھ پر اور ستم ڈھائے جائیں گے۔ چنانچہ واپس جا کر مجھ پر وقفوں کے بعد تھپہ دیکھا جانے لگا۔ مجھے چھتروں سے مارا جانے لگا۔ بجلی کے جھکے دیئے جانے لگے اور گھنٹوں مستقل ایک ہی جگہ کھڑے رہنے کا حکم دیا گیا۔

ایک دن مجھے سیل سے نکال کر اوپر لایا گیا اور انپکٹر درانی کے کمرے کے باہر کھڑا کر دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد قمر عالم ٹہلتے ٹہلتے میرے پاس آیا اور مجھے اپنے ساتھ لے جا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے کو کہا۔ میں نے جب کھڑکی سے باہر دیکھا تو میرا عبد المنان کو الف ننگا، گردن میں ڈنڈا، ہاتھ اوپر کو باندھے ہوئے، گلے میں پشاور چپلوں کا ہار پہنے تپتی دھوپ میں ننگا دوڑاتے دیکھا۔ میرا



صاحب کے ارد گرد کوئی پچاس آدمیوں کا گھیرا تھا جو تالیاں بجا رہے تھے۔ میر صاحب زور زور سے چیخ بھی رہے تھے۔ میرے منہ سے چیخ نکلی اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ قمر عالم نے زوردار قبضہ لگایا۔ میں نے قمر عالم کو کہا کہ میر منان جیسا علامہ اقبال کا پرستار، جمال الدین افغانی کے پان اسلام ازم کے فلسفہ کا حامی اگر جاسوس ہے تو دنیا میں محبت وطن کون ہے۔ اسی پر اس نے مجھے ایک تھپڑ رسید کیا اور کمرہ تشدد میں ملک فیض نامی سب انسپکٹر کے ساتھ یہ کہہ کر بھیج دیا کہ لے جاؤ اسے اور علامہ اقبال یاد کراؤ۔ اس کے بعد ملک فیض نے میرے ساتھ کس طرح ذہنی اور جسمانی تشدد کیا یاد کر کے میرے اب بھی روٹنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

تشدد اور تفتیش کے ”ملے جلے“ پروگرام کے دوران میں نے محاذ کے دیئے ہوئے چندہ اور اپنی حیثیت کے مطلق قمر عالم کو بتلایا کہ وہ کراچی میں میرے انکم ٹیکس وکیل جان عالم سے معلومات حاصل کریں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جان عالم قمر عالم کا بھائی ہے۔ چنانچہ پہلے ایک دن مجھ پر تشدد دہوا اور دوسرے دن قمر عالم نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے کس نے کہا تھا کہ جان عالم اس کا رشتہ دار ہے۔ میں نے جواب دیا مجھے معلوم نہیں ہے۔ اس پر مجھے کہنے لگا کہ وہ میرے ماموں کا لڑکا ہے لیکن میرا دشمن ہے کیونکہ اُس نے میری جائیداد پر قبضہ کیا ہے۔

پھر مجھے ایک روز کہا کہ مجھے دو وعدہ معاف گواہوں کی ضرورت ہے۔ ایک راولپنڈی سے اور ایک کراچی سے، پنڈی سے مجھے ڈاکٹر فاروق مل گیا ہے۔ اب مجھے کراچی سے ایک چاہیے چونکہ تمہارے لئے میرے پاس کئی سفارشیں آئی ہیں۔ اس لئے میں تم پر یہ احسان کروں گا کہ تم کو وعدہ معاف بناؤں۔ تم جس مسجد میں کہو قسم اٹھاؤں گا۔ صرف تمہیں جاسوس ہونے کا اقرار کرنا ہو گا۔ میں نے جواب دیا کہ میں جب جاسوس ہی نہیں تو اقرار کیسے کروں۔

جون کے آخری ایام میں مجھے جس کمرے میں رکھا گیا وہاں مجھے مستقل جگایا جا رہا تھا۔ ایک دن قمر عالم نے مجھے کہا کہ آج ڈی۔ آئی۔ جی آنے والا ہے اور وہ تمہیں اپنے سامنے بلائے

گا۔ اگر ڈی۔ آئی۔ جی کو محسوس ہوا کہ تم پر اطمینان بخش تشہد نہیں ہوا ہے تو یاد رکھنا پھر اب موت ہی تمہارا علاج ہے۔ اس پر اس نے میرے چہرے پر چھتر مار مار کر داغدار بنا دیا۔ پھر دزانی سے معلوم کیا میں کیسا لگتا ہوں۔ دزانی نے جواب دیا کہ اب یہ اصلی کشمیری سیب لگتا ہے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر میں مجھے اطہر کے پاس لے جایا گیا اور اس نے مجھ سے کچھ پوچھ گچھ کی اور واپس بھیج دیا۔

جون کے آخر یا جولائی کے اوائل میں میں نے پولیس افسران کو کانا پھوسی کرتے دیکھا۔

ان میں سے ایک افسر نے جو مجھ پر تعینات تھا کہہ دیا کہ قمر عالم کو تبدیل کیا گیا ہے اور چوہدری بدرالدین ڈی۔ ایس۔ پی کو دوسرے ایس۔ پی کے آنے تک انچارج بنا دیا گیا ہے۔ اس دوران مجھے اطہر کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس نے مجھے کہا کہ میں نے ساری ٹیم کو بدل دیا ہے اب میں دیکھتا ہوں کہ تم اب کیسے ہماری مرضی کے مطابق نہیں چلو گے۔ ایک دو روز کے بعد اطہر کرل معین بٹ کے ہمراہ تشہد کے کمرے میں آیا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے جگاتے ہوئے آٹھ روز ہو گئے ہیں اور مجھ کو لگا تار بجلی کے جھٹکے لگائے جا رہے ہیں۔ اس پر اس نے جواب دیا کہ میں آج رات کو دو بجے سویا ہوں اور میرا سر چکر رہا ہے۔ تم آٹھ دن کیسے جاگ سکتے ہو۔ اس پر اطہر نے حکم دیا کہ دیکھیں کہ یہ آٹھ دن کیسے جاگ سکتا ہے۔ اس لئے آج سے آٹھ دن اس کو جگائے رکھا جائے ساتھ ہی ملک فیض سب انسپکٹر کو حکم دیا کہ مجھے بجلی کے جھٹکے لگائے جائیں تاکہ وہ بھی نظارہ کر سکے۔ اس کمرے میں ایک میز پڑی تھی جس پر میرے جاگنے کے دوران مجھ پر متعین پولیس عملہ باری باری سویا کرتا تھا جس سے وہ ٹوٹ گئی تھی۔ اطہر کی نظر اس میز پر پڑی اور شک گزرا کہ مجھے اس پر سلا یا جا رہا ہے اور اس نے اس کا اظہار وہاں پر کھلم کھلا کیا اور اس روز سے ملٹری کے دو افراد (جن کا تعلق مجھے بعد میں معلوم ہوا کرل معین بٹ کے محکمہ سے تھا اور جو تین روز پہلے ہی سے وہاں دن کو آنا شروع ہو گئے تھے) کو یہ فرض سپرد کیا گیا کہ وہ باری باری رات کو وہیں رہ کر میرے جگانے پر نظر رکھیں۔ چنانچہ اس روز کے بعد یہ دونوں افراد باری باری راتوں کو وہاں سونے کو آتے اور دن میں



بھی ڈیوٹی دیتے۔

اگرچہ ملٹری کے متذکرہ دو افراد نے بھی مجھ پر تشدد کیا لیکن میں زندگی بھر ان کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا کہ انہوں نے مجھے زیر دفعہ 164 جھوٹا ”اقبالی بیان“ دینے سے بچایا۔ یہ اس طرح ہوا کہ ان کی مستقل ڈیوٹی لگنے سے پہلے مجھ پر پولیس زور دے رہی تھی کہ میں ان کی مرضی کا بیان لکھ کر دے دوں چنانچہ بدرالدین نے مجھے جب پہلے زور دیا تو میں نے روتے ہوئے اس کو کہا کہ میں بے گناہ ساتھیوں کے خلاف کس طرح غلط بیان دے دوں۔ میں نے بدرالدین کو کہا میرے قیوم کے گھر میں بالغ بچیاں ہیں اگر میں ان کے خلاف بیان دے دوں تو میں ان بچیوں کی زندگی برباد کروں گا بہتر ہے کہ آپ مطلوبہ بیان ان سے (میرے قیوم) دلوا دیں اور ان کو وعدہ معاف گواہ بنالیں تاکہ وہ بچ کر اپنی بچیوں کی شادی کے لئے آزاد ہو جائیں۔ میری بچیاں تو بہت چھوٹی ہیں اس لئے اگر حکومت مجھے 14 سال بھی جیل میں رکھنا چاہے گی پھر بھی رہا ہو کر میں اپنی بچیوں کی شادی بعد میں کر سکتا ہوں۔ اس کے نتیجہ میں میرے اوپر مزید تشدد کیا گیا۔ چنانچہ میں نے تنگ آ کر غلط بیان دینے کی حامی بھر لی۔ اس سے پہلے قمر عالم نے ایک روز مقبول احمد بٹ کو میرے کمرہ تشدد میں بلایا اور ایک کاغذوں کا بنڈل (جو اس کے سامنے تھا) کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ بیان اس کا لکھا ہوا تھا کہ نہیں۔ مقبول احمد بٹ نے اقرار کیا۔ اس کے بعد مقبول احمد بٹ کو واپس بھیج دیا اور اس مہینہ بیان میں سے ایک جملہ پڑھا جو کچھ اس طرح کا تھا، ”مجھے ایک دن سپرنٹنڈنٹ جیل کے کمرے میں بلایا گیا جہاں افراد (چند پولیس اور جیل کے افسروں کے نام) موجود تھے اور مجھ سے کہا گیا کہ اگر تم زندگی چاہتے ہو تو پاکستان جا کر ہمارا کام کرو۔ وہاں پر لون، منان، قیوم اور امان ہمارے آدمی ہیں“ یہ جملہ اس نے اس مہینہ بیان سے پڑھایا خود زبانی پڑھا، میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ البتہ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ جو پولیس ہم کو الگ الگ ساتھیوں کے متعلق بھارتی جاسوس ہونے کا یقین دلا رہی تھی یہ سب لغو اور جھوٹ ہے کیونکہ اگر مقبول بٹ نے اس قسم کی گفتگو سری نگر جیل

میں کسی سے کی ہوتی تو لازماً وہ جس وقت پاکستان پہنچ گیا تھا تو وہ ہم سے اس کا ذکر کرتا چونکہ نہ میں بھارتی جاسوس تھا اور نہ ہی مقبول بٹ نے مجھ سے اس قسم کے کسی واقعہ کا واپسی پر کوئی ذکر کیا تھا۔ اس لئے میں پولیس کے جھوٹا مقدمہ بنانے کے مقصد کو بھانپ گیا۔

ماتحت پولیس عملہ بھی اپنے بالا افسران سے تنگ تھا اور مجھ پر زور دے رہا تھا کہ میں افسران کی خواہش پوری کروں۔ مجھ سے منوانے کے لئے تشدد، دھونس ہی نہیں بلکہ کبھی کبھی نرمی کا لہجہ بھی اختیار کیا گیا۔ بدرالدین ڈی۔ ایس۔ پی نے مجھے کہا کہ میں کیوں اپنی موت کو دعوت دے رہا ہوں بہتر ہے کہ میں افسران کی مرضی کے مطابق بیان دے دوں تاکہ ان کی اور میری جان چھوٹ جائے۔ جب میں ماتحت افسران سے پوچھتا تھا کہ آپ لوگوں کو کیا ہم گناہ گار نظر آتے ہیں تو وہ جواب دیتے کہ آپ کی بے گناہی پر یقین ہو گیا ہے لیکن کیا کریں ہمیں نوکری کرنا ہے یہ نوکری کرنے والی بات میں نے صرف قلعہ میں ہی نہیں سنی بلکہ کراچی میں بھی بار بار یہ بات مجھ سے کہی گئی تھی۔ یہ بات سن کر میں اپنی تکلیفیں اور مصیبتیں بھول جاتا اور مجھے ان بے ضمیر پولیس والوں پر رحم آتا جو اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے حق و انصاف کو بالائے طاق رکھ کر اپنے ظالم افسران کی خوشنودی کے لئے مجھ سے جھوٹا بیان دلوا کر بے گناہ محبت وطن لوگوں کو پھنسانا چاہتے تھے۔

میں جب مزید جسمانی اور ذہنی اذیت کا متحمل نہ ہو سکا تو چوہدری بدرالدین سے ایک دن میں نے کہہ دیا کہ وہ جس طرح چاہیں مجھے بتائیں میں لکھ دوں گا۔ اس پر ان لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور بدرالدین مجھ سے کہنے لگا کہ وہ ڈی۔ ایس۔ پی ملک شفیع اور انسپکٹر احمد خاں سے کہہ دیں گے کہ وہ میرے لئے ایک بیان تیار کریں (کیونکہ وہی جھوٹے بیانات تیار کرنے کے ماہر تھے) یہ کام انہیں سپرد کر دیا گیا۔ ایک رات چوہدری احمد خاں میرے پاس ایک بیان لے کر آیا اور کہا کہ یہ اس نے میرے القیوم کے لئے تیار کیا ہے اسے ہی بنیاد بنا کر اپنا بیان تحریر کرو۔ جب میں نے پوچھا کہ اس میں بھارتی افسران کے نام، مہینہ وصول شدہ رقوم اور تاریخوں کی جگہیں خالی ہیں



تو اس نے جواب دیا کہ وہ معلومات حاصل کر کے بعد میں بھردی جائیں گی۔ میں وہ بیان پڑھتا رہا، لیکن میرا قلم لکھنے کے لئے اُٹھ نہ سکا۔ دو ایک دن میں نے ادھر ادھر لکھنے کی کوشش کی۔ مجھ پر زور ڈالا جا رہا تھا کہ میں جلد از جلد بیان لکھ دوں۔ لیکن ایک طرف جھوٹا بیان لکھنے کو دل نہ مانتا اور دوسری طرف مسلسل جگانے سے بھی میں بیان میں وہ رنگ آمیزی نہ کر سکا جو پولیس والے چاہتے تھے۔ اس دوران میں نے ملٹری والوں کو اعتماد میں لے کر کہہ دیا کہ پولیس والے مجھ سے جھوٹا بیان دلوانا چاہتے ہیں کیونکہ وہ بھی مجھے جسمانی اذیت پہنچا رہے تھے، لیکن اُن میں سے ایک نے مجھ سے کہا کہ میں سچ پر قائم رہوں۔ دوسرے کو مجھ پر کچھ یقین نہیں آ رہا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے میرا قیوم کا بیان دیکھا تھا اور اس میں بھارت سے ڈھائی ملین روپے آنے کا ذکر تھا۔ (لاکھ کا ترجمہ یہ شخص ملین کرتا تھا) پولیس والے رات کو میرا قیوم صاحب کے لئے تیار کردہ بیان میرے پاس چھوڑ جاتے اور صبح ملٹری والوں کے آنے سے پہلے ہی واپس لے جاتے تھے۔

جب اطہر نے کرنل معین بٹ سے مل کر مجھ پر متذکرہ بالا دو فوجیوں کو متعین کرایا تو پھر مجھے وہ بیان نہیں دیا گیا البتہ جب وہ فوجی ادھر ادھر ہو جاتے تو مجھ سے کہا جاتا کہ میں بیان مکمل کر لوں۔ میں میرا قیوم صاحب کے لئے تیار کیا ہوا بیان مانگتا، لیکن ان فوجیوں کے ڈر سے نہیں دیا جاتا تھا۔

اس دوران قمر عالم ایس۔ پی کی جگہ ملک صدیق تبدیل ہو کر آچکا تھا اور اس نے پوچھ گچھ اور تشدد کے فرائض سنبھال لئے تھے۔ نئے ایس۔ پی نے بہتر کارکردگی دکھانے کی خاطر اپنے پیشرو سے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن:

درد کا حد سے گزرتا ہے دوا ہو جانا

مجھ پر اس قدر تشدد ہو چکا تھا کہ میں اب اس کا عادی ہو گیا تھا۔ میرے جسم کا انگ انگ گویا تکلیف اور درد کا احساس کھو چکا تھا۔ قلعے والوں کے تشدد کے مختلف طریقوں میں سے ایک

حربہ مسلسل جگائے رکھنے کا ہے جس کا میں اُد پر ذکر کر چکا ہوں۔ لیکن شاید اس فاضل عدالت کو اندازہ نہ ہو سکے کہ مسلسل جگائے رکھنا اور سونے نہ دینا کس قدر شدید اور کرہناک عذاب ہوتا ہے۔ اس لئے میں ذرا تفصیل سے اس عمل کی جزئیات بیان کرتا ہوں۔

جگائے رکھنے کے لئے ملزم کو مستقل کھڑا رہنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ ادھر اُدھر گھمایا پھرایا جاتا ہے۔ تھوڑی ہلکی ورزش کرائی جاتی ہے تاکہ تھکن کی وجہ سے نیند کا غلبہ ہو۔ نماز میں زیادہ وقت گزارنے نہیں دیا جاتا۔ بیت الخلاء میں ہر آدھ منٹ کے بعد آواز دی جاتی ہے۔ کہیں اونگھ آجائے تو سلگتے ہوئے سگریٹ سے جسم داغا جاتا ہے یا بجلی کا تار انگلی یا دونوں کانوں میں جوڑ کر جھٹکے دیئے جاتے ہیں جس سے دماغ میں سے بجلی گزر جاتی ہے۔ ہچک مشین سے نہ صرف کانوں کو کھینچا جاتا ہے بلکہ انگلیوں کو دبایا جاتا ہے (اس عمل کے نتیجے میں میرے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی دو مہینے پہلے تک بے حس تھی) انگلیوں کے جوڑوں پر بھی اس سے ضربیں لگائی جاتی ہیں۔ جگانے کے دوران ”ملزم“ سے کہا جاتا ہے کہ باتیں کرتے رہو اور اگر زندگی میں کوئی عشق کیا ہے یا بدکرداری کی ہے تو وہ قصے سناؤ۔ مجھ سے پولیس افسران یورپ میں کی ہوئی مہینہ عیاشیوں کی تفصیلات سننے کے متمنی تھے۔ میں نے کچھ کیا ہوتا تو انہیں سنا تا۔ لیکن ان کے خیال میں ایسا کوئی متمول شخص ہو ہی نہیں سکتا جو عیاشیاں نہ کرتا ہو اور خاص طور پر یورپ جا کر۔ چنانچہ وہ میرے بیان کو جھوٹ سمجھ کر ایذا پہنچاتے تھے۔ ایک کوشش یہ بھی کی جاتی ہے کہ ملزم کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا جائے تاکہ نیند کا غلبہ شدید ہو۔ جب جگانے کا عمل مجھ پر شروع کیا گیا تو میں نے برائے نام کھانا کھایا البتہ چائے اس لئے زیادہ پی کہ اس سے نیند کے روکنے میں مدد ملتی تھی۔ ذہنی اذیت پہنچانے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ تھکے دو الے کمرے میں لے جا کر گھنٹوں کھڑا رکھتے اور ساتھ ساتھ ڈیوٹی پر متعین افسر اور عملہ انتہائی فحش اور غلیظ گالیاں میری ماں بہن اور بیٹیوں کے نام، میری قوم کے نام، میری قوم کے راہنماؤں کے نام اور میرے دینی اور مذہبی پیشواؤں کے نام دیتا رہتا تھا اور میں قبر درویش برجان درویش یہ



سب کچھ سننے پر مجبور تھا۔ رات کے ایک دو بجے سے لے کر صبح کے آٹھ بجے تک کا وقت اذیت ناک ہوا کرتا تھا۔ اس دوران ڈیوٹی پر متعین سپاہی مجھے بازوؤں سے پکڑ کر زبردستی گھمایا کرتے تھے۔

مسلل بیداری سے آخری دنوں میں میری یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب مجھ سے کوئی سوال کیا جاتا تو ایک آدھ جملہ اردو میں بولنے کے بعد میں عالم بے خودی میں کشمیری بولنے لگتا پھر جب مجھے محسوس ہوتا کہ میں کشمیری بول رہا ہوں تو اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کرتا۔ کئی دفعہ ملک صدیق کے سامنے بیٹھے میرا سر اس کی میز پر گر گیا اور مجھے سلگتا ہوا سگریٹ لگا کر ہوش میں لایا گیا۔ ان آیام میں میرے ساتھ نماز میں اکثر یوں ہوتا تھا کہ مجھے معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ میں کتنے سجدے کر رہا ہوں، کیا پڑھ رہا ہوں یا کتنی دیر سجدے میں پڑا رہا ہوں۔ سپاہی مجھے آوازیں دے کر اٹھاتے تھے۔ رات کو کمرے میں چلتے چلتے عالم بے خودی میں دیوار سے ٹکرا جاتا۔ میرے دماغ میں عجیب گونج دار آوازیں پیدا ہوتیں۔ میرا سر زخمی ہو جاتا اور پولیس والے زور زور سے قہقہے لگاتے۔ آخری آیام میں مجھے اپنے ہاتھوں اور دیگر اعضاء پر چمکتے ہوئے ذڑوں کی چلتی ہوئی قطاریں دکھائی دیتیں۔ دیواروں پر بھیا نک اور وحشت ناک تصویریں نظر آتیں۔

جبری بے خوابی کے دوران ایک روز مجھے گارد کے متذکرہ فوجیوں نے تھوڑی دیر کے لئے ایک بازو والی کرسی پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ کرسی پر بیٹھتے ہی میں بیہوش ہو گیا۔ پھر مجھے اتنا یاد ہے کہ مجھے دو آدمی کرسی سے اٹھا کر جگانے کی کوشش کر رہے تھے اور میں نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا۔ بعد میں مجھے انہی فوجیوں کی کوشش سے ایک بار سونے کی اجازت مل گئی۔ خدا جانے میں کب تک سویا رہا جب میرے ہوش و حواس بحال ہو گئے تو مجھے اس فوجیوں نے بتایا کہ انہوں نے اپنے کرنل کو میری بے ہوشی کے دوران ٹیلیفون پر صورت حال سے آگاہ کیا تھا اور میری موت واقعہ ہونے کا اندیشہ ظاہر کیا تھا اور انہوں نے پولیس افسران کی مخالفت کے باوجود کرنل سے اپنی

ذمہ داری پر میرے سونے کی اجازت حاصل کی تھی۔

ایک روز میں نے بدرالدین ڈی۔ ایس۔ پی سے کہا آج کل کے ترقی یافتہ دور میں تفتیش کے جدید نئے مشینی طریقے اور آلات ایجاد ہو چکے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہماری پولیس اب تک انسانیت سوز تشدد کے فرسودہ طریقوں کو اپنائے ہوئے ہے۔ میں نے کہا کہ اگر میری باتوں کا اعتبار نہیں کیا جاتا تو مجھے (DRUG TEST یا LIE DETECTOR) دیا جائے میں تیار ہوں۔ میں نے پیش کش کی کہ کسی بیرونی ملک سے (LIE DETECTOR) مشین اور اُس کا ماہر منگایا جائے۔ میں سارا خرچہ برداشت کروں گا لیکن میری یہ پیشکش اس وقت مسترد کر دی گئی۔ ایک روز غالباً 8 جولائی مجھے کمرہ تشدد میں لایا گیا۔ اس روز صبح ہی سے مجھے کھانے کو کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ 10/9 بجے کے قریب دو آدمی کمرے میں آئے مجھے بتایا گیا کہ وہ ڈاکٹر ہیں۔ چونکہ میں کمزور ہو گیا ہوں اس لئے میرا طبی معائنہ کرنے آئے ہیں، نبض وغیرہ دیکھنے کے بعد مجھے لیٹنے کے لئے کہا گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ کمزوری کی وجہ سے مجھے گلوکوز کا انجکشن دیا جا رہا ہے۔ دراصل یہ گلوکوز نہیں بلکہ بے ہوشی کا ٹیکہ تھا اور ڈاکٹر نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ گویا پولیس کا یہ ڈاکٹر نفسیات بھی اپنے پیشہ ورانہ ضابطہ اخلاق اور انسانیت سے عاری تھا۔ جب میں ہوش میں آیا تو میں نے دیکھا کہ میرے سر ہانے ڈی۔ آئی۔ جی اطہر اور ملک صدیق مجھ سے سوالات کر رہے ہیں اور میرے پاؤں کی جانب انسپکٹر احمد خاں کاغذ و قلم لئے سوالات کے جوابات لکھ رہا ہے۔ غنودگی کے عالم کے آخری دو سوالات میرے ذہن میں اب تک محفوظ ہیں۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ امان اللہ کا کن کن سفارت خانوں میں آنا جاتا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ ایک دفعہ وہ افروائشین یک جہتی کمپین کے سلسلہ میں کیوبا کے سفارت خانے میں گئے تھے جس کا مجھے علم ہے۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ میرا منان کو خطوط وغیرہ کون لکھ کر دیتا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ وہ خود اعلیٰ تعلیم یافتہ، ہیں انہوں نے علی گڑھ سے ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کیا ہوا ہے۔ انہیں کسی سے لکھوانے کی کیا ضرورت۔ جو نبی ڈاکٹر کو



احساس ہوا کہ میں ہوش میں آ رہا ہوں اس نے پولیس افسران کو اشارہ کیا اور وہ کمرے سے جلدی باہر چلے گئے۔ اس کے بعد مجھے چارپائی سے اٹھایا گیا تو میں نے محسوس کیا کہ میری ٹانگیں بالکل بے جان ہو گئی ہیں۔ چنانچہ دو آدمیوں نے مجھے سہارا دے کر ایک اور کمرے میں پہنچایا۔ جہاں افسر لوگ خود تو بٹھنے ہوئے مرغ کی ضیافت اڑاتے رہے اور مجھے بجلی کے جھکے لگوا کر اپنے لئے تفریح طبع کا سامان کرتے رہے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہی عمل میر عبد القیوم صاحب کے ساتھ بھی دہرایا گیا۔ بے ہوشی کے عمل کے دوسرے دن مجھے سپرنٹنڈنٹ قلعہ کے دفتر میں لے جایا گیا جہاں (LIEDETECTOR) مشین موجود تھی۔ یہ مشین E.C.G کی مشین کے مشابہ ہے اور اس کی طرح تاریں ننگے بدن پر لگائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ دو سپرنگ کی طرح کے تار انگلیوں میں لگائے جاتے ہیں۔ یہ مشین فوج کے محکمہ سے منگائی گئی تھی جسے فوج کا ایک صوبیدار میجر لگانے آیا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ اس سے پہلے یہ مشین شہناز گل، فیروز عبد اللہ اور اس کے مشتبہ ساتھیوں پر استعمال ہو چکی تھی۔ LIEDETECTOR لگانے سے پہلے صوبیدار میجر نے مجھ پر واضح کر دیا کہ یہ مشین اس صورت میں مجھ پر استعمال کی جائے گی کہ میری رضامندی حاصل ہو۔ میں نے بخوشی اپنی رضا مندی دے دی۔

بات معمولی تھی لیکن میرے دل میں اس بات سے فوج کے جوانوں کے ملنے بے پناہ عزت اور محبت بڑھ گئی۔ کیونکہ دو فوجی جوانوں کی موجودگی کی وجہ سے ہی میں پولیس کا تیار کردہ جھوٹا بیان دفعہ 164 کے تحت قلمبند کرانے سے بچ گیا۔ اور (LIEDETECTOR) مشین صوبیدار میجر نے مجھے میری رضامندی سے لگائی۔

مجھ پر (LIEDETECTOR) مشین تو فوجی افسر نے لگائی لیکن پہلے سے تیار کردہ سوالات چوہدری بدرالدین نے پوچھے۔ پہلے دن اٹھارہ سوال کرنے کے بعد بجلی بند ہو گئی اور مشین چلائی نہ جا سکی باقی ماندہ سولہ سوالات اگلے دن 10 جولائی کو پوچھے گئے جو دو فوجی جوان میری تفتیش

میں شامل کئے گئے تھے وہ مشین کے ماہر صوبیدار میجر کے شاگرد تھے اور مشین کی کارکردگی اور طریقے سے واقف تھے۔ دوسرے یا تیسرے روز فوجی جوانوں میں سے ایک نے مجھے آکر پہلی بار ”لون صاحب“ کہہ کر پکارا اور مبارکباد دی کہ مشین کی رپورٹ سے ظاہر ہو گیا ہے کہ میں سچا ہوں۔ اس کے بعد ان فوجیوں کا رویہ میرے ساتھ نہایت ہمدردانہ ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے ایک دوبار مجھے اپنے میس MESS سے چاول بھیجے جو ان دنوں میرے لئے نعمت عظمیٰ کا درجہ رکھتے تھے۔ (LIE DETECTOR) مشین کے عمل کے آخری روز یعنی 10 جولائی کی رات کو مجھے بجائے سیل کے اندر بند کرنے کے باہر کے پنجرہ نما حصے میں بند کیا گیا۔ اس جگہ مجھے صحن اور سیڑھی کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ شام کو باہر ایک گاڑی رکی بہت سے آدمیوں کا شور سنائی دیا تو باہر جھانک کر میں نے امان اللہ صاحب کو ان کی پیٹھ اور قراقلی ٹوپی سے پہچانا۔ انہیں ہتھکڑیوں میں کافی دیر سیڑھیوں کے نیچے کھڑا رکھا گیا۔ اس طرح مجھے ان کو گلگت سے لاہور لانے کا علم ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے امان اللہ صاحب کو ایک بار اور دیکھا جب کہ انہیں میری کوٹھڑی کے نزدیک کسی اور سیل میں لے جایا جا رہا تھا۔

ایک روز میں نے سیل کے قریب سیڑھیوں سے دھماکے کے ساتھ کسی کے گرنے کی آواز سنی۔ اس آواز کے ساتھ ہتھکڑیوں کی جھنکار بھی شامل تھی۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو میر عبد المنان تھے جن کی آنکھوں پر پٹی باندھی ہوئی تھی اور انہیں میرے سیل سے آگے والے سیل میں لے جایا جا رہا تھا۔

ایک واقعہ جس نے مجھے قلعہ میں تشدد برداشت کرنے کی طاقت بخشی اور پولیس کے حسب منشا جھوٹا بیان دینے سے روکا وہ یہ تھا کہ جب مجھے کمرہ تشدد سے واپس سیل میں منتقل کیا گیا تو میں نے دیوار پر بڑے حروف میں پنسل سے نصیر وانی کا نام لکھا ہوا دیکھا اور اس کے نیچے شاعر انقلاب مجبور کا شہید کا لکھا ہوا یہ شعر تھا۔



کری کس ، کاشریا آزاد ، پتھر س منر ژہ نالاں چھوک  
 ژہ پنے دستہ پنہ نن مشکلن آسان پیدا کر  
 (وائے کشمیری تو جو اس پتھرے میں گریہ وزاری کر رہا ہے تجھے اس سے کون آزاد کرائے گا، تو خود  
 اپنے ہاتھوں اپنی مشکلات کا حل پیدا کر)

آخری دنوں میں مجھے چوہدری بدرالدین کی تحویل سے نکال کر ڈی۔ ایس۔ پی ملک  
 شفیع کی تحویل میں دے دیا گیا۔ اس شخص نے افسران بالا کو یقین دلایا تھا کہ وہ مجھ سے جھوٹا اقبال  
 جرم کرانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے بھی مجھے جسمانی اذیت کے علاوہ ذہنی اذیت  
 بھی پہنچائی۔ اُس نے دورانِ تفتیش ایک بار اس سے کہا کہ میرے متعلق مسٹر کے۔ ایچ خورشید اور  
 سردار قیوم سے معلوم کرے کہ میں نے کس طرح کشمیر کی سیاسی جماعتوں کو کشمیر کی جنگ آزادی  
 لڑنے کیلئے متحد کرنے کی کوشش کی ہے تو اس نے خورشید صاحب کے نام ایک بڑی وزنی گالی دی  
 اور کہا کہ تم سب کشمیری غدار ہو وقت آنے پر ایک ایک کو کفرِ کردار تک پہنچایا جائے گا۔ اس طرح  
 جب میں نے لاہور اور کراچی میں مسٹر بھٹو سے ملاقاتوں کا ذکر کیا تو ان کے نام بھی شفیع نے گالیاں  
 دے کر کہا کہ ہم سب کچھ جانتے ہیں کہ وہی شخص جہاز کو جلانے کا ذمہ دار ہے۔ جب میں نے قائد  
 عوام مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے نام بھی یچی خاں کے سازشی گروہ کے اس کارندے کی زبان سے فحش  
 گالیاں سنیں تو میں اپنے پر کئے گئے تشدد کو بھی بھول گیا۔ یچی خاں اور اس کا یہ جی حضوری ٹولہ  
 انگریزوں کی معنوی اولاد ہے۔ یہ لوگ آزادی کی قدروں کو نہیں پہچان سکتے اور ان کے لئے عام  
 شہری آزادیاں، عوامی حقوق اور عوامی قیادت سب سے بڑی گالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن سیاسی  
 کارکنوں اور ان کے آباء اجداد نے برعظیم ہندو پاکستان سے انگریزوں کو نکالا تھا۔ یہ گروہ ابھی تک  
 ان سے اس کا انتقام لیتا چلا آتا ہے۔

ملک شفیع نے تجریص و ترغیب کے تمام حربے آزمائے اور جب میں جھوٹ بولنے پر تیار

نہ ہوا تو خوف و ہراس پھیلایا گیا۔ جسم و روح کی کوئی اذیت ایسی نہیں جو مجھے نہ پہنچائی گئی ہو اور ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ میں پولیس کی گھڑی ہوئی کہانی کو بیان کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ لیکن میرے زندہ ضمیر نے مجھے ملامت کی اور میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ موت قبول کر لوں گا، لیکن۔۔۔۔۔ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ قلعہ میں مختلف افسروں کے سامنے میں نے جو بیانات دیئے تھے اس سے اظہر علی اور اس کی ٹیم کو یہ پوری طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھے کبھی بھی عدالت میں لے جایا گیا تو عدالت کے سامنے اصل حقائق آجائیں گے۔ سر سے پاؤں تک تشدد کے نشانات بھی میرے لئے نجات کا سبب بنے۔ مجھے اس دور میں کوئی مجسٹریٹ دیکھ لیتا تو وہ یہی سمجھتا کہ میرا زانیہ بیان ہو رہا ہے۔ کیونکہ میں نیم مردہ تھا، یہی وجہ تھی کہ پولیس کے درندہ صفت انسان جب مجھے یہ کہتے تھے:

”تمہارا دنیا میں کوئی دوست ساتھی یا رشتہ دار نہیں ہے۔ مارشل لاء کے زمانے میں پاکستان کے بڑے بڑے بہادر لیڈروں کی زبانیں بند ہو چکی ہیں۔ پولیس کا گلہ دبایا جا چکا ہے اور ملک میں ہائی جیکرز اور ان کے گروہ کے خلاف پوری طرح نفرت پھیلائی جا چکی ہے اس لئے کوئی آواز تمہارے حق میں نہیں اٹھ سکے گی۔ اگر تم اپنے چھوٹی چھوٹی بچیوں کے لئے زندہ رہنا چاہتے ہو تو پولیس کی ان خواہشات کو پورا کرو“

لیکن یہ تمام دھمکیاں مجھے راہِ راست سے نہ ہٹا سکیں۔ میرا تعلق خدا کے ساتھ اور بڑھ گیا اور یہ حقیقت ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے میرا اور کوئی سہارا نہ تھا اور اللہ کی یاد نے میرے ایمان کو اتنا قوی کر دیا تھا کہ میں خود کو حسن ناصر شہید کے قاتلوں کے ہاتھ میں بھی پا کر اپنے مقام سے ایک انچ نیچے نہ ہرکا اور میرا دل مجھے بار بار یہی کہتا تھا کہ کیا تم دنیا میں تنہا نہیں آئے تھے اور کیا تم اس دنیا سے تنہا نہیں جاؤ گے۔ میرے قلبی اطمینان نے مجھے جھوٹ بولنے کی ذلت اور رسوائی سے بچالیا اور اس دور میں کچھ ایسے مواقع بھی آئے کہ فوجی آمروں نے جنہیں ہم پر پھرہ دینے پر ہٹا رکھا تھا، ان کے دل بھی ہلکے ہو گئے تھے۔



تشدد کا یہ دور اتنا طویل ہے کہ شاہی قلعہ لاہور چھوڑنے کے بعد بھی ہمیں اس سے چھٹکارا نہ مل سکا۔ اطہر علی نے ہمارا جیل میں بھی پیچھا کیا اور اس نے جیل خانہ جات کے سپرنٹنڈنٹوں کو ہمیں قید تنہائی میں رکھنے کے لئے خطوط لکھے۔ ہماری ملاقاتوں پر پابندی بدستور رکھی گئی۔ جیل خانہ جات کی فائلیں اس الزام کی تائید کرتی ہیں۔ میری بڑی بچی کی عمر چھ برس ہے اس نے مجھے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ لکھے۔ لیکن میری بچی کا خط مجھے ڈیڑھ مہینہ گزرنے کے بعد ملا اور کتنے ہی خطوط ایسے ہیں جو مجھے آج تک نہیں دیئے گئے۔ مجھ پر بھی خط و کتابت کی پابندیاں تھیں۔ اطہر علی کو جیل حکام پر بھی اعتبار نہیں تھا اس لئے میری ملاقات کرانے کے اختیارات اس نے مارشل لاء حکام سے اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے اور ہمارے ملاقاتیوں کو اس نے نہ صرف تنگ کیا بلکہ ہمارے خلاف ہمارے سرال کو بھڑکاتا رہا۔

اطہر علی کے انتقام کی آگ پھر بھی ٹھنڈی نہ ہوئی اور اسے جب پتا چلا کہ میرے کاروبار کی دیکھ بھال میرا جھوٹا بھائی کر رہا ہے تو اس نے میرے بھائی کو اس حالت میں گرفتار کیا کہ وہ بیمار پڑے تھے۔ اطہر علی ان کی گرفتاری کے بعد بہت خوش ہوا تھا کیونکہ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب میں معاشی طور پر بھی بالکل تباہ ہو جاؤں گا۔ اطہر علی نے میرے بھائی کی گرفتاری 13 اگست کو عمل میں لائی اور میرے بھائی کو ریغمال رکھ کر مجھ سے جھوٹا اقبال جرم کرانے کا ایک اور حربہ آزمایا۔ دوسری طرف میرے بھائی کو یہ کہا جاتا رہا کہ وہ مجھے پولیس کی خواہش کے مطابق بیان دینے پر رضامند کرے۔ میرے بھائی کو جن واقعات کی بناء پر گرفتار کیا گیا تھا اس کا ان سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا اور ویسے بھی وہ مقدمات مارشل لاء نے واپس لے لئے ہیں۔ میرے بھائی کی گرفتاری سے محض پولیس کو بلیک میلنگ مطلوب تھی، لیکن اطہر علی کو یہ صدمہ جان لیوا ثابت ہوگا اور وہ اس دُکھ کو اپنے ساتھ قبر میں لے کر جائے گا کہ وہ مجھ جیسے غریب الدین یا سیاسی کارکن سے اپنے مطلب کا جھوٹا بیان نہ لے سکا۔ اطہر علی نے ہمارا پیچھا اس معزز عدالت میں پیش ہونے کے بعد بھی نہ چھوڑا اور اپنے عملے

سمیت ہمیں پریشان کرتا رہا۔ لاہور اور پنڈی میں اس کی ہدایت کے مطابق ہمیں جیل حکام نے تنہائیوں میں رکھا۔ کسی سے ملاقات کی اجازت نہ دی اور لاہور کمپ جیل میں بیت الخلاء کے بغیر تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں محبوس رکھا جاتا تھا اور ان سیلوں میں مقید رکھا جاتا رہا جنہیں جیل کی زبان میں ”قصوری“ سیل کہا جاتا ہے۔ ان سیلوں میں سزایافتہ قیدیوں کو رکھا جاتا ہے جو جیل کے اندر بھی جرائم کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ ہم نے اس ظلم و تشدد کے خلاف پاکستان کی اس باوقار عدالت کی توجہ بھی دلائی، جس پر معزز عدالت نے غلام حسین بٹ کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ جیل سپرنٹنڈنٹ کو بتائے کہ وہ ہم قیدیوں کو قانونی مراعات سے محروم نہ رکھیں لیکن

ع ہمارے بھی ہیں مہربان کیسے کیسے

غلام حسین بٹ ایس۔ پی نے جو فاضل عدالت کا حکم لے کر جیل حکام کے پاس پہنچے تھے اپنی طرف سے اس نادر شاہی حکم کا اضافہ کیا کہ ہم قیدیوں کو آپس میں بھی نہ ملنے دیا جائے۔ جیل قواعد کے تحت اس طرح کی ہم پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی تھی اور ہم لوگوں نے جیل حکام کو بتا دیا تھا کہ ہم ان کی متشددانہ پالیسی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کریں گے۔ ”پاکستان ٹائمز“ میں جنوبی افریقہ کے ایک قانون کے پروفیسر کا چھپا ہوا آرٹیکل آیا تھا جس میں قید تنہائی کو قانون کی نظر میں (TORTURE) تشدد ظاہر کیا گیا تھا جس پر میں نے یہ مضمون جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو دکھایا تھا اور قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دے رکھی تھی اس کے باعث سپرنٹنڈنٹ جیل کو جب غلام حسین بٹ نے نادر شاہی حکم سنایا تو وہ سخت برا فروخت ہو گیا تھا۔ ہم نے جو ظلم و ستم سہے ہیں اس کا بیان کرنا ہمارے بس میں نہیں۔ جسم کے ایک ایک جوڑ میں آج بھی درد محسوس ہو رہا ہے حالانکہ جسمانی تشدد ختم ہوئے کئی ماہ ہو چکے ہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ جوڑوں کا درد ہمارا قبر تک پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ ہم جسمانی طور پر بیکار ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے قابل احترام ساتھی ڈاکٹر فاروق حیدر صاحب نے ہمارے خلاف وعدہ معاف گواہ بن کر جو جھوٹی شہادت دی ہے اس کے



لئے ہمارے دل میں کسی طرح کی کدورت پیدا نہیں ہوئی۔ ہمارا یہ ساتھی مجسم شرافت اور نیک سرشت انسان ہے اس کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا گیا ہے وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ جب وہ کوٹ لکھپت جیل میں قیدی تھا تو اسے وہاں قید تنہائی میں رکھا گیا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بالکل ہی بے خبر رہا۔ جیل کے قیدی اور ملازم اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ جیل خانے میں جب تک رہا اس کا ذہن مفلوج تھا اور ہمیشہ کھویا کھویا سا رہتا تھا۔ جیل تک اطہر علی کا عملہ اس کا پیچھا کرتا رہا اور انہوں نے جو بھی اس کا پیچھا چھوڑا تو ڈاکٹر فاروق حیدر ایک سچے انسان کے روپ میں پھر لوٹ آیا۔ اس کی روح جاگ اُٹھی اور اس کا خفتہ ضمیر بیدار ہو گیا اور اس نے دھاڑیں مار مار کر لوگوں کو ہماری بے گناہی اور اپنی اذیت کی دردناک داستانیں سنائی ہیں۔ اسکی چیخوں کی آواز عدل کے ایوانوں تک پہنچ چکی ہے۔ ڈاکٹر فاروق حیدر سیاسی زندگی میں نئے نئے داخل ہوئے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ اس ملک میں سیاسی کارکنوں کے ساتھ ڈاکوؤں، قاتلوں اور راہزنوں سے زیادہ بُرا سلوک کیا جاتا ہے۔ وہ پولیس کے ظالمانہ ہتھکنڈوں سے ناواقف تھے۔ انہیں یہ بھی علم نہیں تھا کہ عدالت میں بیان دینے کی پاداش میں وہ پولیس کے مزید ظلم و تشدد سے محفوظ رہ سکیں گے۔ عدالت میں جب ان کے بیان ہو رہے تھے تو ان کے دل و دماغ پر مارشل لاء کا ڈراؤنا بھوت بُری طرح سوار تھا۔ پولیس کے بدنام زمانہ افرامک شفیع ڈی۔ ایس۔ پی اور احمد خاں انسپکٹر ان کے ساتھ عدالت کے اندر تک آتے تھے اور اطہر علی اور ملک صدیق ایس۔ پی عدالت کے باہر رہتے تھے اور وقفہ کے دوران ڈاکٹر فاروق حیدر پھر ظالم پولیس کے اس جبرمٹ میں اپنے آپ کو پاتے تھے۔ پولیس افرامک نہیں اپنے گھیرے میں لے کر اپنی جھوٹی کہانی رٹاتے رہتے تھے۔ پولیس کے اس شرمناک فعل کی طرف ہمارے صفائی کے معزز وکیل نے قابل احترام عدالت کی توجہ بھی دورانِ شہادت مبذول کرائی تھی۔

قلعہ میں ہمارا ایک ایک دن ایک ایک ہزار سال کا تھا اور ایک ایک رات قیامت سے

لمبی تھی۔ قلعہ کے زمانے میں جو ”اہل حرم“ کے ہاتھوں ہم پر گزری ہے اس کی تفصیل جب کبھی فرصت کے لمحات ملے اور صحت نے اجازت دی تو میں قلمبند کر کے پاکستان کی عظیم قوم کو بتاؤں گا کہ ان کے وطن میں آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ جسمانی اور ذہنی تشدد کے ساتھ ساتھ سیلوں کے حالات، نظر بندوں کی خوراک، بیماری کی حالت میں انسانوں کا تسخیر، بھنگی اور سقہ کے حالات بھی ضبط تحریر میں لاؤں گا۔ لیکن اس مرحلے پر اسلامی مملکت کی اسلامی عدالت کے سامنے محض مسلمان ہونے کی وجہ سے ہم پر جو قیامت ڈھائی گئی ہے، اس کی طرف صرف اتنا اشارہ کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ جہاں مجھ سے سب کچھ چھین لیا گیا وہاں مجھ سے قرآن پاک کا نسخہ بھی چھین لیا گیا تھا۔ وظائف اور درود و سلام کے نسخے بھی لے لئے گئے تھے اور جب میں نے اس پر احتجاج کیا تو مجھے اسلامی مملکت کے پاسانوں نے یہ جواب دیا کہ قرآن پاک بھی READING MATERIAL کی تعریف میں آتا ہے اور اس قلعہ میں اس کے لے جانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ممکن ہے ان کا جواب درست بھی ہو کیونکہ یہ قلعہ ایک ذبح خانہ ہے جہاں جانور نہیں انسان ذبح ہوتے ہیں۔ یہ قلعہ ایک جہنم کدہ ہے جہاں انسانوں کو جلایا جاتا ہے۔ اس قلعے میں نجاست کے ڈھیر ہیں اور ان ڈھیروں کی اطہر علی اور اس کی ٹیم حفاظت کرتی ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ بر عظیم ہندو پاکستان کے وہ عظیم مسلمان حکمران اپنے قلعوں کو اس لئے بناتے تھے کہ انہیں جہنم کدہ بنادیا جائے؟ کیا اس شاہی قلعہ کے ساتھ شاہی مسجد کے مینار جھک کر سوال نہیں کر رہے ہیں کہ اس قلعہ کے اندر قرآن پاک کی صدائیں گونجا کرتی تھیں اور خدا کے رسولؐ پر درود بھیجا جایا کرتا تھا۔ یہاں میزانِ عدل رکھی گئی تھی اور ظلم و ستم کے ستارے ہونے انسان یہاں فریادی بن کر آیا کرتے تھے اور اپنی حاجت براری کے بعد واپس جایا کرتے تھے۔ لیکن اس قلعہ میں اب انسانوں کی بجائے انسان خور درندے رہتے ہیں جن کے دل میں خدا کا خوف نہیں ہے۔ اس اسلامی مملکت میں اس سے بڑھ کر مذہب کی کوئی توہین نہیں ہو سکتی۔ انگریزی سامراجی کے زمانے



میں بھی کسی نظر بند مسلمان کو قرآن پاک کے مطالعہ سے روکا نہیں جاتا تھا لیکن اسلام کے دعوے دار حکومت کے دور میں مسلمانوں سے قرآن پاک چھین لئے گئے اور انہیں پابندی سے نماز ادا کرنے کی اجازت بھی نہیں دی جاتی تھی۔

مجھے جب قلعہ سے سکھر ڈسٹرکٹ جیل پہنچایا گیا تو میں نے پہلی بار انسانوں کی شکل دیکھی اور مجھے احساس ہوا کہ سکھر جیل قلعہ کے مقابلہ میں ایک جنتِ ارضی ہے۔ میرے وطن عزیز کو بھی جنتِ ارضی سے تشبیہ دی جاتی ہے لیکن ہمیں اس کا اتنا شدید احساس پہلے نہ تھا جواب پیدا ہو گیا ہے۔ میں اپنے وطن عزیز کی آزادی کے لئے اپنی بقیہ زندگی وقف کر چکا ہوں۔ سکھر جیل میں مجھے ایک نئی دنیا ملی ہے۔ میں ویسے بھی بچپن سے سندھ میں رہتا چلا آیا ہوں اور سندھ کی دھرتی سے مجھے خاص پیار اور لگاؤ ہو چکا ہے۔ سکھر جیل کے نہ صرف سیاسی اور اخلاقی قیدیوں بلکہ حملہ کے برتاؤ نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ میں سندھ کے ایک ایک ذرے سے پیار کرتا ہوں۔ میری روح کو ایک نئی توانائی حاصل ہوئی ہے اور دورانِ حراست مجھے جس پستی میں گرایا گیا تھا اس سے پھر اٹھ کھڑا ہوا ہوں۔ میرے دل سے مایوسی اور بددلی کی وہ گھٹن دور ہو گئی ہے جو قلعہ سے ورثہ میں ملی تھی۔ میں اپنے اندر ایثار و قربانی کا پھر وہی جذبہ پاتا ہوں جو گرفتاری سے قبل موجود تھا۔ میرے نزدیک زندگی ہی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہے اور میں اسے خدا کی راہ میں لٹا کر سچی خوشی محسوس کرتا ہوں۔ میری جنگِ آزادی صرف کشمیر کے مظلوم عوام کو ظلم سے نجات دلانے تک محدود نہیں ہے بلکہ دُنیا پر صرف خدا کی حکومت چاہتا ہوں۔ انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلانا میرا ایمان ہے اور میں ایمان کی یہ پونجی لے کر دنیا سے واپس اپنے حقیقی وطن لوٹ جانا چاہتا ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ میرے گناہوں کو معاف فرمائے اور دُنیا کے ظالمانہ فیصلوں کو برداشت کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔

جی ایم لون



**G. M. Lone**

توڑ اس دستِ جنائش کو یا رب  
جس نے روحِ آزادی کشمیر کو پامال کیا (اقبال)



**India Pakistan get out from Jammu Kashmir**



تحقیق و اشاعت کا معیاری ادارہ  
نیشنل انسٹیٹیوٹ آف کشمیر سٹڈیز  
0344-5563443 nika.mirpur@gmail.com